www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

January 2003 • No. 314

دنیا میں ہر آدمی کے لئے کوئی نہ کوئی نقصان مقدر ہے۔ دانش مند
وہ ہے جو نقصان کو خدا کا فیصلہ سمجھ کر اس پر راضی ہو جائے۔

غم کو دعا میں ڈھالنا

قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اُن کے سوتیلے بھائیوں کے غلط سلوک کی وجہ سے وہ وقت آیا جب کہ حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب بظاہر اپنے دو عزیز بیٹوں سے محروم ہوگئے۔ اس حادثہ کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے یہ دعائیہ کلمہ نکلا: انما أشکوا بثّی وحزنی الی اللہ (یوسف ۸۶) یعنی میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

پیغمبر کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ایک اہم حقیقت کو بتاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن جب کسی غم سے دوچار ہوتا ہے تو وہ عام انسان کی طرح آہ اور فریاد میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایمانی شعور اُس کے غم کو دعا میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف رجوع ہو کر اُس سے التجا کرنے لگتا ہے کہ وہ اُس کے کھونے کو یافت میں بدل دے، وہ اُس کی محرومی کی حسن تلافی فرمائے۔

کسی انسان کے ساتھ جب غم اور محرومی کا تجربہ پیش آتا ہے تو اُس وقت اُس کے لیے ردعمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک ہے، انسانوں کی طرف دیکھنا، اور دوسرا ہے، خدا کی طرف دیکھنا۔ جو لوگ حادثہ کے وقت انسان کی طرف دیکھیں وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ انسان کے خلاف فریاد و فغاں میں مبتلا ہوجائیں۔ مگر جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اس قسم کے تجربہ کے بعد خدا کو یاد کرنے لگے، وہ چھیننے والے کے بجائے دینے والے کو اپنا مرکزِ توجہ بنالے گا۔ اُس کا ذہن مایوسی کے بجائے اُمید کا آشیانہ بن جائے گا۔

دعا ایک طاقت ہے۔ نازک وقتوں میں دعا مومن کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ دعا اس اعتماد کا سرچشمہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی کھونا آخری نہیں، بلکہ ہر کھونے میں از سرِ نو پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

ہر آدمی کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ ایسے لمحات میں خدا سے دعا کرنا آدمی کے دل کو سکون بخشتا ہے۔ دعا گویا کسی آدمی کے لئے کرائسس مینیجمنٹ (crisis management) کا بہترین ذریعہ ہے۔

اہل جنت کے درجات

قرآن میں جنت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ لوگو، دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ (الحدید ۲۱)

دوسری جگہ اہل جنت کی زبان سے یہ خبر دی گئی ہے کہ — اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اُس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔ پس کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا (الزمر ۷۴)

قرآن کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنت ایک ایسی دنیا ہوگی جو تمام جنتیوں کے لیے کھلی ہوئی ہوگی۔ کوئی جنتی انسان اس وسیع دنیا میں جہاں چاہے گا اپنا مبوّأ (اقامت گاہ) بنا سکے گا۔ اقامت یا سکونت کے اعتبار سے ہر جنتی کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔

دوسری آیتوں اور حدیثوں سے یہ ثابت ہے کہ جنت میں فرق مراتب ہوگا۔ کچھ جنتی افراد دوسرے جنتیوں کے مقابلہ میں زیادہ اونچی جنت کے مالک ہوں گے۔ مثلاً قرآن کے مطابق، اُن میں سے کچھ سابق ہوں گے اور کچھ مقتصد (فاطر ۳۲) اب سوال یہ ہے کہ یہ فرق مراتب کس اعتبار سے ہوگا۔ غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ فرق استمتاع (enjoyment) کے اعتبار سے ہوگا۔ جنت اپنے ظواہر کے اعتبار سے غالباً ہر ایک کے لیے یکساں ہوگی مگر جنت کی نعمتوں سے محظوظ ہونے کا جو معاملہ ہے، وہ ہر ایک کے لیے یکساں نہ ہوگا۔ کسی کو جنت کی نعمتوں سے زیادہ حظّ ملے گا اور کسی کو نسبتاً کم۔

محظوظیت کا یہ فرق معرفت یا شعور کے فرق کی بنیاد پر ہوگا۔ دنیا کی زندگی میں جو شخص شعور یا معرفت کے جس درجہ پر پہنچا ہوگا اُسی درجہ کے برابر وہ جنت کی نعمتوں سے محظوظ ہو سکے گا۔ گویا مکانی اعتبار سے جنت کے تمام افراد یکساں طور پر اقامت میں شریک ہوں گے، مگر جو شخص شعوری اعتبار سے ارتقاء کے جس درجہ پر ہوگا اُسی نسبت سے وہ جنت کی نعمتوں سے متمتع ہو سکے گا۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجئے۔ محدث البیہقی نے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے: ان عبداللہ بن رواحۃ قال لصاحب لہ: تعال حتی نؤمن ساعۃً، قال: أو لسنا بمؤمنین؟ قال: بلیٰ ولکنا نذکر اللہ فنزداد ایماناً (حیاۃ الصحابۃ، الجزء الثالث، صفحہ ۱۳)۔ یعنی عبداللہ ابن رواحہ صحابی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ آؤ، ہم ایک ساعت کے لیے ایمان لائیں۔ ساتھی نے کہا کہ کیا ہم مومن نہیں ہیں؟ ابن رواحہ نے کہا کہ ہاں، مگر جب ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ہم اپنے ایمان میں اضافہ کرتے ہیں۔

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک انسان وہ ہے جو کلمۂ توحید کا اقرار کرنے کے بعد یہ سمجھے کہ وہ صاحب ایمان ہوگیا، جو ایمان اُس کو ملنا تھا وہ اُسے مل گیا۔ ایمان یا عقیدہ کے اعتبار سے اب اُسے کچھ اور پانا نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انسان وہ ہے جو بار بار اللہ کو یاد کرے، وہ اللہ پر غور وفکر کرے۔ اور اس طرح وہ اپنی معرفت ایمانی کو بڑھاتا رہے۔ اُس کا ایمان مسلسل شعوری ترقی کرتا رہے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب ایمان میں معرفت کے اعتبار سے درجات ہوتے ہیں۔ کوئی اعلیٰ معرفت کے درجہ پر ہوتا ہے اور کوئی اُس سے کم معرفت کے درجہ پر۔ معرفتِ حق کا یہ فرق جنت میں استمتاع کے اعتبار سے فرق پیدا کردے گا۔

ایک مومن وہ ہے جس نے قرآن میں **الحمد للہ رب العلمین** پڑھا تو اُس نے کسی شک اور تردد کے بغیر اس حقیقت کو مان لیا۔ اُس نے یقین (conviction) کے درجہ میں اُس کو قبول کرلیا۔ قرآن کا دوسرا قاری وہ ہے کہ جب اُس نے **الحمد للہ رب العلمین** پڑھا تو اس آیت میں تخلیق الٰہی کے ایسے گہرے معانی اُس کے ذہن میں تازہ ہوگئے کہ اُس کے اندر اہتزاز (thrill) کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ وہ حمد خداوندی کے جذبہ سے سرشار ہوگیا۔

اسی طرح ایک مومن وہ ہے جس کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو وہ اُس کو ایک سچائی مان کر اُس کو قبول کرلے۔ مثلاً چھینک آنے پر ایک شخص اگر کہے کہ: **الحمد للہ**، تو اُس کو سن کر اُس کی زبان

پر یہ کلمہ آجائے کہ یرحمک اللہ۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا مومن وہ ہے جس کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اپنی بڑھی ہوئی معرفت کی بنا پر اُس کا یہ حال ہو کہ اللہ کی عظمت کے احساس سے اُس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اللہ کی کبریائی کو سوچ کر اُس کا دل دہل اُٹھے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **انما المؤمنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم** (الانفال ۲)۔

اسی طرح ایک مومن وہ ہے جس نے قرآن میں یہ آیت پڑھی: **والذی ھو یُطعِمنی ویَسقین** (الشعراء ۷۹)۔ اُس نے اس آیت کو اُس کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے لیا اور اُس کی زبان پر شکر کے الفاظ آگئے۔ دوسرا مومن وہ ہے جو اس آیت کو پڑھے تو اُس کے ذہن میں حقائق کا ایک دفتر کھل جائے۔ وہ سوچے کہ زمین وآسمان کے اندر بے شمار سرگرمیاں ظہور میں آئیں۔ اُس کے بعد یہ ممکن ہوا کہ وہ چیز بن کر تیار ہو جس کو ہم کھانا اور پانی کہتے ہیں اور جو زندگی کی بقا کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ سوچ کر اُس کے سینے میں کمالاتِ خداوندی کے اعتراف کا ایک سمندر موجزن ہو جائے۔ حتیٰ کہ یہ احساس اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی شکل میں بہہ پڑے۔

یہ دونوں ہی مومن حمدِ خداوندی کے احساس کے حامل ہیں۔ مگر معرفت کے فرق کے اعتبار سے دونوں کے درمیان اتنا زیادہ فرق پیدا ہو گیا ہے کہ اُس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ جو لوگ سچے دل کے ساتھ ایمان لائیں، جن کی نیتیں درست ہوں۔ جو بقدر استطاعت اللہ کے احکام کی پابندی کریں وہ جنت میں جائیں گے۔ مگر یہ ایمان کا ابتدائی درجہ ہے۔ ایمان کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو معرفت کے سفر کے ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے۔ جو ربّانی سمندر میں فکری غوطہ لگانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں قسم کے اصحابِ ایمان کے لیے جنت ہے۔ مگر جنت کی نعمتوں سے محظوظ ہونے کے معاملہ میں ایک مومن اور دوسرے مومن کے درمیان وہی فرق ہو جائے گا جو دنیا میں معرفتِ حق کے اعتبار سے دونوں کے درمیان پایا جاتا تھا۔

پختگی کیا ہے

پختگی یہ ہے کہ آدمی اپنے غصہ پر قابو پالے اور اختلافات کو تشدد اور تخریب کے بغیر دور کر سکے۔ پختگی تحمل اور برداشت کا نام ہے اور اس صلاحیت کا کہ وقتی خوشی کو دیر طلب مقاصد کے لیے قربان کر دیا جائے۔ پختگی اس استعداد کا نام ہے کہ کسی تلخی کے بغیر، ناخوش گوار اور مایوس کن حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ پختگی انکساری کا نام ہے۔ ایک پختہ شخص یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ ''میں غلطی پر تھا''۔ پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ پُر امن طور پر رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

Maturity is the ability to control anger, and settle differences without violence or destruction. Maturity is patience, the willingness to give up immediate pleasure in favour of the long-term gain. Maturity is the capacity to face unpleasantness and disappointment without becoming bitter. Maturity is humility. A mature person is able to say, “I was wrong”. Maturity is the ability to live in peace with things we can not change.

پختگی دراصل حقیقت واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ وہ ساری صفتیں جن کو پختگی کہا جاتا ہے وہ سب حقیقت واقعہ کے اعتراف سے پیدا ہوتی ہیں۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جانے کہ کہاں اس کی حد ختم ہوتی ہے اور کہاں سے دوسری طاقتوں کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق، اُس کے لیے ممکن ہے۔ اور وہ کیا چیز ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق، اس کے لیے ممکن نہیں۔ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اقدام سے پہلے اُس کے انجام کو سوچے، وہ اپنے عمل کی نتیجہ خیز منصوبہ بندی کرے۔

حقیقت واقعہ کا اعتراف آدمی کے اندر یہ بصیرت پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرے۔ وہ یہ جانے کہ کیا چیز اُس کے لیے قابلِ حصول ہے اور کیا چیز اُس کے لیے قابل حصول نہیں۔ پختہ انسان ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور بالفرض اگر وہ کسی معاملہ میں کامیاب نہ ہو تو وہ اپنی

ناکامی سے سبق لے کر اپنے آپ کو زیادہ صاحب بصیرت بنا لیتا ہے، اور اسی کے ساتھ زیادہ طاقتور بھی۔ پختگی کسی انسان کی نہایت اعلیٰ صفت ہے۔

پختہ (mature) کی تعریف ڈکشنری میں اس طرح کی گئی ہے—ایک وجود جس کا نشو ونما پوری طرح ہوا ہو، وہ اپنی ترقی کے کمال تک پہنچا ہو:

A being full-grown, or fully developed.

ایک درخت کی پختگی یہ ہے کہ وہ ابتدائی درجہ سے شروع ہو کر پھول اور پھل کے آخری درجہ تک پہنچ جائے، وہ ہر اعتبار سے ایک مکمل درخت بن جائے۔ اسی طرح انسان کی پختگی یہ ہے کہ وہ اپنی عقلی صلاحیت کے اعتبار سے آخری درجۂ کمال تک پہنچ جائے۔

تاہم انسان کی پختگی کا تعلق صرف حیاتیات یا نفسیات سے نہیں ہے بلکہ اُس کا گہرا تعلق علم سے ہے۔ جو آدمی اپنے علم کو بڑھائے، جو تجربات سے سبق سیکھے، جو دنیا سے معرفت کا رزق لے کر اپنے ذہنی وجود کو مکمل کرے، وہ گویا پختگی کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچا۔

پختہ انسان صاحبِ بصیرت انسان ہوتا ہے۔ پختہ انسان اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ وہ معاملات میں صحیح رائے قائم کرے۔ غیر پختہ انسان خوش فہمیوں میں جیتا ہے اور پختہ انسان حقائق میں۔ غیر پختہ انسان جذباتی فیصلہ کرتا ہے اور پختہ انسان جذبات سے اوپر اٹھ کر اپنی رائے بناتا ہے۔ غیر پختہ انسان کا اقدام جلد بازی کا اقدام ہوتا ہے اور پختہ انسان کا اقدام سوچا سمجھا ہوا اقدام۔ غیر پختہ انسان کا طریقہ لڑائی بھڑائی کا طریقہ ہوتا ہے اور پختہ انسان کا طریقہ صبر اور تحمل کا طریقہ۔ غیر پختہ انسان متشددانہ طریقِ کار میں یقین رکھتا ہے اور پختہ انسان پُرامن طریقِ کار میں۔

غیر پختہ انسان اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ اپنی غلطی سے کوئی سبق نہیں سیکھتا۔ اس کے برعکس پختہ انسان جب کوئی غلطی کرتا ہے تو فوراً ہی وہ کھلے دل سے اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ غلطی کا یہ اعتراف اُس کے لیے اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ وہ ہر تجربہ سے سبق سیکھے۔ وہ اپنی شخصیت کو بہتر سے بہتر بناتا رہے۔ اُس کا ذہنی ارتقاء کسی رکاوٹ کے بغیر مسلسل جاری رہے۔

حفاظت کیجئے

سفید کپڑے پر کوئی دھبہ لگ جائے تو آدمی فوراً اُس کو دھو کر صاف کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر فوراً اُس کو صاف نہ کیا تو بعد کو دھبہ نہیں مٹے گا اور اس کا کپڑا مستقل طور پر داغ دار ہو جائے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آدمی کے ذہن کا ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے بار بار آدمی کے ذہن میں کوئی نہ کوئی بری بات آتی رہتی ہے۔ مثلاً انتقام کا جذبہ، حسد کا جذبہ، دشمنی کا جذبہ، شکایت کا جذبہ، نفرت کا جذبہ، وغیرہ۔ اس قسم کے جذبات اور احساسات بار بار ہر مرد اور ہر عورت کے ذہن میں صبح وشام آتے رہتے ہیں۔ وہ آدمی کو منفی احساسات میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔

ایسا ہر تجربہ گویا ایک قسم کا نفسیاتی دھبّہ ہے۔ وہ آدمی کے نفسیاتی وجود کو داغ دار کرنے کا ایک واقعہ ہے۔ ان نفسیاتی دھبوں کے لیے بھی آدمی کو وہی کرنا ہے جو وہ مادی دھبوں کے لیے کرتا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہئے کہ جیسے ہی اس قسم کا کوئی دھبّہ اُس کے نفسیاتی وجود پر لگے تو فوراً وہ اس کو اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔ وہ کوئی نہ کوئی توجیہہ کرکے فوراً اپنے آپ کو اس کے زیر اثر آنے سے بچالے۔ جو مرد یا عورت ایسا نہ کرے اُس کو ایسا نہ کرنے کی یہ بھاری قیمت دینی پڑے گی کہ وہ نفسیاتی دھبّہ اُس کے وجود کا مستقل حصہ بن جائے گا۔ وہ اُس کی داخلی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے داغ دار کر دے گا۔

جدید نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے دماغ کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک زندہ ذہن اور دوسرا خفتہ ذہن۔ فطری نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی بات آدمی کے ذہن میں داخل ہوتی ہے تو پہلے دن وہ اُس کے زندہ ذہن میں رہتی ہے۔ اس کے بعد آدمی جب رات کو سوتا ہے تو نیند کی حالت میں انسانی دماغ کا فطری نظام اس بات کو زندہ ذہن سے نکال کر خفتہ ذہن میں پہنچا دیتا ہے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو پھر وہ بات آدمی کے پورے وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔ اُس کو

ذہن سے نکالنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر عورت اور مرد دوسروں کے بارے میں شکایتوں اور تلخیوں میں جیتے ہیں۔ ہر ایک کسی نہ کسی کے خلاف منفی نفسیات کا شکار رہتا ہے۔ مگر عین اسی وقت وہی مرد اور عورت اپنے بیٹا اور اپنی بیٹی کے لیے ہمیشہ مثبت احساسات کا نمونہ بنے رہتے ہیں۔ حالاں کہ ہر مرد وعورت کو اپنے اولاد سے بھی اسی طرح شکایات کے تجربے ہوتے ہیں جس طرح دوسروں سے ہوتے ہیں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ شکایتوں کے باوجود لوگ اپنی اولاد کے معاملہ میں ہمیشہ معتدل بنے رہتے ہیں۔ جب کہ یہی لوگ دوسروں کے بارہ میں معمولی شکایتوں کو لے کر اُس کے خلاف ہمیشہ کے لیے نفرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ لوگ ان دونوں کے معاملہ میں دو الگ الگ انداز اختیار کرتے ہیں۔ اُن کو جب اپنی اولاد کی طرف سے شکایت کا تجربہ ہوتا ہے تو اُسی وقت وہ کوئی نہ کوئی توجیہہ کر کے اُس کو ختم کر دیتے ہیں۔ اپنی اولاد کے خلاف شکایت کو وہ اپنے ذہن سے فوراً نکال دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب اُن کو دوسروں سے کوئی شکایت پیش آجائے تو وہ اُس کو اپنے ذہن میں بٹھا لیتے ہیں۔ وہ اُس کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ وہ لوگوں سے اس کا چرچا کرتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ہر روز اُس کو اپنے ذہن میں تازہ کرتے رہتے ہیں۔

اسی فرق کی بنا پر ایسا ہے کہ اپنی اولاد کے خلاف شکایتیں اُن کے وجود کا حصہ نہیں بنتیں، وہ پیدا ہوتے ہی فوراً ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس دوسروں کے خلاف شکایتیں ہمیشہ کے لیے ان کے وجود کا حصہ بن جاتی ہیں، وہ کسی طرح ختم نہیں ہوتیں۔

یہ ذاتی تجربہ ہر آدمی کو بتاتا ہے کہ اُس کو دوسروں کے معاملہ میں کیسا ہونا چاہئے۔ اُس کو ویسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کے معاملہ میں ہے — جب بھی کسی کے خلاف کوئی منفی احساس پیدا ہو تو وہ فوراً ہی اس کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ کسی بھی حال میں وہ اُس کو اپنے ذہن کا مستقل حصہ نہ بننے دے۔

رشی کیش کا سفر

رشی کیش میں پرمارتھ نکیتن کے نام سے ایک انٹرنیشنل ہندو سنٹر ہے۔ اس کی شاخیں بہت سے ملکوں میں قائم ہیں۔ ۲۔۳ جون ۲۰۰۲ کو اس سنٹر کے تحت ایک بڑا پروگرام ہوا جس میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر رشی کیش کا سفر ہوا۔ یکم جون ۲۰۰۲ کو روانگی ہوئی اور ۴ جون کو دوبارہ دہلی واپس آیا۔

یکم جون ۲۰۰۲ کی صبح کو ۶ بجے ہمارا قافلہ دہلی سے روانہ ہوا۔ جب ہماری گاڑی دہلی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے یوپی میں داخل ہوئی تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بظاہر آپ ایک مادی سفر کر رہے ہیں لیکن اگر آپ سوچیں تو آپ کا یہ سفر ایک روحانی سفر بن جائے گا۔ میں نے کہا کہ یہ کار کیا ہے۔ کار جامد مادہ (dead matter) کا متحرک مادہ (moving matter) کی صورت اختیار کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ ایک تبدیلی (conversion) کا معاملہ ہے۔ یہ کنورژن ہماری دنیا کا ایک عالمی اصول ہے۔ ایک کنورژن وہ ہے جو فطری طور پر ہوتا ہے۔ مثلاً ناقابل خوراک (non-edible) چیز کا بدل کر قابل خوراک (edible) چیز کی صورت اختیار کرنا۔ دوسرا کنورژن وہ ہے جس کو انسان قانون فطرت کے استعمال کے ذریعہ کرتا ہے۔ کار اور ہوائی جہاز اور موبائل ٹیلی فون جیسی چیزیں، اسی دوسری قسم کے کنورژن کی مثالیں ہیں۔

سفر کے دوران ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ رشی کیش اس وقت ہندو روحانیت کا عالمی سنٹر بن گیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بتایا کہ کناڈا کا ایک سیاح رشی کیش گیا۔ واپسی کے بعد اس نے اپنے مشاہدات پر مبنی ایک رپورٹ تیار کر کے شائع کی جس کا عنوان یہ تھا:

A week spent in the flakes of Shankara.

اس رپورٹ میں سیاح نے لکھا تھا کہ رشی کیش اس وقت ہندو سوامیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بیشتر سوامی کسی نہ کسی طور پر رشی کیش سے وابستہ ہیں۔ ان کے شاگرد نہ صرف ہندستان میں بلکہ بیرونی ملکوں

میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے سوامیوں کے پاس ہر وقت موبائل ٹیلی فون موجود رہتا ہے۔ اکثر کے پاس انٹرنیشنل رومنگ ہوتا ہے۔ دور دور کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ان کے شاگرد اپنے مسائل کے لئے اُن سے رجوع کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً بیماری، تجارتی گھاٹا، حادثہ وغیرہ۔ سوامی لوگ موبائل اپنے کان میں لگائے ہوئے اپنے شاگردوں کو ان کے سوالات کا جواب دیتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے لکھا تھا کہ ٹکنالوجی آج روحانیت کی ایک شدید ضرورت ہے:

Technology is most wanted by spirituality.

ہماری گاڑی چلتے ہوئے ایک ریستوران میں داخل ہوئی۔ یہ ایک وسیع اور خوبصورت ریستوران تھا۔ اس کے وسیع احاطہ میں کثرت سے گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کھتولی کے قریب واقع اس ریستوران کا نام چیتل گرانڈ (Cheetal Grand) ہے۔ اس ریستوران کا مالک ایک مسلمان ہے۔ مجھے اس ریستوران کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔ چنانچہ میں نے لوگوں کو بتایا کہ اس مسلمان کے اندر دوسروں کے لیے ایک قابل تقلید مثال ہے۔ وہ اس علاقہ میں گویا ایک ٹرنڈ سٹر (trend setter) بن گیا ہے۔

دہلی سے نینی تال جانے والی سڑک پر بیس سال پہلے مسافروں کے لیے بہت معمولی قسم کے ہوٹل ہوتے تھے جس کو ڈھابہ کہا جاتا تھا۔ چیتل گرانڈ کے مالک نے پہلی بار مغربی انداز پر یہاں مسافروں کی سہولت کے لیے وہ چیز بنائی جو مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں پہلے سے قائم تھی۔ بیس سال پہلے اس قسم کا جدید ریستوران صرف یہی ایک تھا۔ لوگ دہلی سے یہ سوچ کر چلتے تھے کہ راستہ میں اُنہیں چیتل گرانڈ میں ٹھہرنا ہے اور وہاں کھانا پینا ہے اور ضروریات سے فارغ ہونا ہے۔ اس کا اثر دوسروں پر پڑا۔ ہر ایک نے اپنے ڈھابا کو ماڈرنائز کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ راستہ میں میں نے کئی جگہ اسی انداز کے دوسرے ریستوران دیکھے۔ اگر چہ اپنی کوالٹی کے اعتبار سے چیتل گرانڈ اب بھی اس راستہ میں غالباً نمبر ایک ہے۔

ہماری گاڑی اندر پال چلا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میں چالیس سال سے گاڑی چلا رہا

ہوں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی گاڑی کا کبھی ایکسیڈنٹ ہوا یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے پوچھا کہ اس کا راز کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں رفتار کی حد (speed limit) کے اندر اپنی گاڑی چلاتا ہوں۔ کسی کا دباؤ ہو تب بھی میں اپنی گاڑی کو تیز نہیں چلاتا۔ مثلاً کوئی پیچھے سے ہارن دے رہا ہو یا بیٹھی ہوئی سواری تیز دوڑانے کو کہے تب بھی میں حد کے اندر رہ کر اپنی گاڑی کو چلاتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ یہی قومی پالیسی کا معاملہ بھی ہے۔ ہمیں اپنی قومی پالیسی خود اپنے مثبت فیصلہ کے تحت چلانا چاہئے، نہ کہ دوسروں کے ردّعمل کے طور پر۔ مثلاً فریقِ ثانی اگر مشتعل کرے تب بھی ہمیں مشتعل ہوئے بغیر اپنا عمل جاری رکھنا چاہئے۔

اس گفتگو کے دوران ہمارے ایک ساتھی خالد انصاری نے ایک انگریزی مقولہ سنایا — تیز رفتاری بہت اچھی لگتی ہے مگر وہ ہلاک کرتی ہے:

Speed thrills but kills.

راستہ میں کئی جگہ گاڑیاں الٹی ہوئی پڑی تھیں۔ اس قسم کے حادثے ان سڑکوں پر اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ ان حادثات کے اسباب زیادہ تر دو ہوتے ہیں — شراب پی کر گاڑی چلانا یا غیر ذمہ دارانہ طور پر گاڑی دوڑانا۔

اس موقع پر ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ ان کے گھر کی ایک خاتون ڈرائیونگ لائسنس لینا چاہتی تھیں۔ وہ دہلی میں ٹسٹ دینے کے لیے گئیں۔ ان کے بیچ میں ۱۰ آدمی تھے۔ ٹسٹ کے بعد ۸ آدمیوں کو ڈرائیونگ لائسنس دے دیا گیا۔ خاتون نے کہا کہ میں نے ان لوگوں سے اچھا چلایا تھا پھر تم نے مجھ کو لائسنس کیوں نہیں دیا۔ جواب دینے والے نے جواب دیا کہ ہمارا آج کا کوٹہ ۸ لائسنس کا تھا وہ پورا ہو گیا۔ آپ کل آئیں تو ہم پہلے نمبر پر آپ کو لائسنس دے دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ انڈیا میں، خاص طور پر دہلی میں، اتنے زیادہ ایکسیڈنٹ ہونے کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کو ''کوٹہ سسٹم'' کی بنیاد پر لائسنس دئے جاتے ہیں، نہ کہ واقعی معنوں میں ٹریننگ کی بنیاد پر۔

اس طرح کی باتوں میں راستہ طے ہوتا رہا، یہاں تک کہ چھ گھنٹہ کا سفر کرنے کے بعد ہم لوگ

دوپہر کے وقت پرمارتھ نکیتن پہنچے۔ یہاں کے آشرم میں تقریباً ایک ہزار کمرے ہیں۔ مجھے یہاں کمرہ نمبر ۲۱۵ میں ٹھہرایا گیا۔

سب سے پہلے میں نے غسل کیا۔ اس کے بعد ہم لوگوں کو دوپہر کا کھانا کھلایا گیا۔ کھانا بالکل سادہ تھا، اسی کے ساتھ وہ صحت بخش اور زود ہضم تھا۔ قدیم تصور کے مطابق، کھانا صرف دو مقصد کے لیے ہوتا تھا— لذت اور شکم سیری۔ مگر موجودہ سائنسی زمانہ میں دو اور تصور زیادہ اہم سمجھے جانے لگے ہیں۔ اور وہ ہیں متوازن خوراک (balanced diet) اور غذائی اجزاء (nutritive value) کا حامل ہونا۔

رشی کیش ہندو دھرم کے بڑے مرکزوں میں سے ایک مرکز ہے۔ یہاں کا موجودہ پروگرام ایک ایسا پروگرام تھا جس میں ہندو دھرم کے بڑے بڑے نمائندے شریک ہو رہے تھے۔ یہاں ہندو مذہب کا ایک مکمل مظاہرہ متوقع تھا۔ اس لیے میں بعض دوسرے پروگراموں کو کینسل کرکے رشی کیش آیا تاکہ ہندو مذہب کو قریب سے دیکھ سکوں اور اس کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کروں۔

یکم جون کی شام کو مغرب کے بعد افتتاحی پروگرام تھا۔ میں جس آشرم میں ٹھہرا تھا وہ گنگا کے عین کنارے تھا۔ یہاں گنگا کے اندر کشتیوں کی مدد سے بہت بڑا پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ چاروں طرف دور دور تک روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ممتاز ہندو رہنما گنگا کے کنارے مخصوص نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فضا میں لاؤڈ اسپیکر پر گائے جانے والے بھجن کی آواز گونج رہی تھی۔ اس بھجن کا ایک حصہ جو بار بار دہرایا جا رہا تھا وہ یہ تھا۔ میّا گنگا تم ہی داتا۔

ایک طرف یہ الفاظ فضا میں گونج رہے تھے اور دوسری طرف میں یہ دیکھ رہا تھا کہ گنگا ہمالیہ پہاڑ سے اتر کر تیزی کے ساتھ میدانی علاقے کی طرف بہہ رہی تھی۔ چوں کہ یہاں گنگا ڈھلوان پر ہوتی ہے اس لیے یہاں اس کا بہاؤ بہت تیز ہوتا ہے۔ اس کا مسلسل بہتا ہوا پانی اپنی پرشور آواز کے ساتھ گویا یہ کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کی طرف سے مسخر کیا ہوا ہے۔ وہ ایک برتر طاقت کے حکم کے تحت ہے۔ ایک طرف ہزاروں لوگ گنگا کی پوجا کے لیے ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف خود

گنگا اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنی پر شور موجوں کے ذریعہ یہ اعلان کر رہی تھی کہ میں ایک عاجز مخلوق ہوں۔ معبود کوئی دوسرا ہے، نہ کہ میں۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہاں گنگا کا پانی ویسا صاف وشفاف نہ تھا جیسا کہ وہ ہمالیہ کی چوٹی پر ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ایک گدلے پانی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ چند مہینہ پہلے میں سوئزرلینڈ گیا تھا۔ سوئزرلینڈ کو جھیلوں کا ملک سمجھا جاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کی جھیلوں کا پانی صاف وشفاف اپنی اصلی حالت میں تھا۔ یہ ایک بڑا عجیب منظر تھا۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ سوئزرلینڈ کے لوگ اپنی جھیلوں کی صفائی کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس گنگا کا حال یہ ہے کہ ہر قسم کی گندگی اس میں بہادی جاتی ہے۔

ایک ہندو نے گفتگو کے دوران کہا کہ گنگا کے بارے میں ہندو عقیدہ یہ ہے کہ اس میں نہانے سے ہر قسم کے پاپ دھل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی شخص جرم کر کے آئے اور گنگا میں ڈبکی لگالے تو وہ اپنے جرم سے پاک صاف ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ یہاں اشنان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ گنگا کے ساحل پر آباد شہروں اور بستیوں کی گندگی مسلسل بہہ کر گنگا کے پانی میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے گنگا کے پانی کی کثافت (pollution) اتنا بڑھ گئی ہے کہ اب بہت سے ہندو اس میں نہانا پسند نہیں کرتے۔ کیوں کہ گنگا کا پانی اب آلودگی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، نہ کہ پاک کرنے کا ذریعہ۔

میں نے سوچا کہ پانی کا جو ذخیرہ اپنی صفائی کے لئے خود ہی دوسرے انسانوں کا محتاج ہو پھر وہ کسی انسان کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ سوئزرلینڈ اور ہندستان کا یہ فرق گویا ایک مشاہداتی ثبوت ہے کہ پانی ایک مجبور مخلوق ہے، وہ کوئی با اختیار ہستی نہیں۔

یکم جنوری کی شام کو گنگا پوجا کے مناظر دیکھنے کے بعد گنگا کے کنارے ہم لوگ ایک سجے ہوئے مقام پر لے جائے گئے۔ اس کو روشنیوں اور رنگین کپڑوں سے مزین کیا گیا تھا۔ یہاں کھانے کا انتظام میز کرسی پر تھا۔ کھانے کے دوران کچھ تعلیم یافتہ ہندو میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ایک صاحب جو انگریزی اخبار کے کالمنسٹ ہیں، انہوں نے کہا کہ میں سچائی اور روحانیت (spirituality) میں یقین

رکھتا ہوں۔ میں نے ہر مذہب کا مطالعہ کیا ہے۔ اسلام کے بارے میں آپ کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ سچائی کی تعریف کس طرح کرتے ہیں اور یہ کہ اس کی کیا پہچان ہے کہ کسی کو سچائی مل گئی۔ وہ غیر مربوط انداز میں دیر تک بولتے رہے مگر کوئی واضح بات نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ آپ متعین اور محدد (specific) الفاظ میں میرے سوال کا جواب دیں۔ مگر کافی دیر تک سننے کے باوجود میں ان کی تقریر سے اپنے سوال کا واضح جواب نہ پا سکا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ سچائی ایک ذاتی تجربہ (experience) کی بات ہے، اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

پنجاب سے آئی ہوئی ایک خاتون پروفیسر بھی کھانے کی میز پر موجود تھیں۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ گنگا میا میری ہر ضرورت کو پوری کر دیتی ہیں۔ جب بھی میں ان کو پکارتی ہوں میں ان کو موجود پاتی ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ اس سلسلہ میں آپ اپنا کوئی عملی تجربہ بتائیں۔ انہوں نے کہا، ایسے بہت تجربات ہیں۔ کافی اصرار کے بعد انہوں نے ایک تجربہ بتایا۔

انہوں نے کہا کہ رشی کیش کے اس پروگرام میں میں آنا چاہتی تھی۔ میں اس کے لئے بہت زیادہ خواہش مند تھی۔ میں نے اپنے شوہر سے اپنی اس خواہش کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ وہ انویٹیشن (دعوت نامہ) کے بغیر کہیں نہیں جاتے۔

میرے مَن میں یہ تھا کہ گنگا میا انویٹیشن بھیج دیں تو میرا کام بن جائے۔ اگلے دن صبح کی ڈاک سے مجھے انویٹیشن مل گیا، اس طرح میں یہاں پہنچ گئی۔

میں نے کہا کہ اب آپ میری مثال لیجئے۔ مجھے یہاں کے پروگرام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا اور نہ میں نے اس میں شرکت کی خواہش کی تھی۔ مگر اپنے آپ مجھے اس کا انویٹیشن مل گیا۔ اب یہ بتائیے کہ اگر آپ کا انویٹیشن گنگا میا نے بھیجا تو میرا انویٹیشن کس نے بھجوایا۔ میرے اس سوال کا وہ کوئی جواب نہ دے سکیں۔

ایک اور تعلیم یافتہ ہندو نے گفتگو کے دوران کہا کہ میں اس طرح کے مندروں اور مذہبی مقامات پر بہت زیادہ گیا ہوں۔ اب میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ بھگوان کے مندر بہت بن چکے

اب انسان کا مندر بناؤ۔ مندر کے نام پر جھگڑے بھی بہت ہو رہے ہیں۔ انسان کے مندر میں کوئی جھگڑا نہ ہوگا۔ انسان کے مندر سے ان کی مراد یہ تھی کہ ایجوکیشن اور اسپتال جیسے سوشل کام بڑے پیمانہ پر کئے جائیں۔

اس طرح کی گفتگوؤں سے میں نے سمجھا کہ برادران وطن کی بہت بڑی تعداد ہے جو ہندوازم کے موجودہ روایتی ڈھانچہ سے غیر مطمئن ہے۔ اس کی فطرت اس کے سوا کچھ اور چاہتی ہے۔ مگر اس ''کچھ اور'' کا کوئی واضح نقشہ اس کے سامنے نہیں۔

رشی کیش کے آشرم میں ہر طرف مختلف ہندو بت نصب کیے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر پر ہر وقت ہندو روایات کے مطابق، سنسکرت کے منتر یا بھجن سنائی دیتے رہتے تھے۔ یہاں ایک ضخیم انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم بھی تیار کی جارہی ہے۔ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ۱۲ ہندستانی اور ۱۲ بیرونی ہندو پروفیسر شامل ہیں۔ ڈاکٹر شیشا گری راؤ اس کے ہیڈ ہیں۔ میں نے اس انسائیکلوپیڈیا کے کچھ حصوں کو دیکھا۔ مجھے یہ انسائیکلو پیڈیا بظاہر انسائیکلوپیڈیا آف ہندو ازم کے بجائے انسائیکلوپیڈیا آف ہندو مائتھالوجی نظر آئی۔ مثلاً اس میں بتایا گیا ہے کہ گنگا ایک دیوتا کی جٹا سے نکلی۔ اس قسم کی افسانوی باتوں سے یہ انسائیکلوپیڈیا بھری ہوئی ہے۔ ''انسائیکلوپیڈیا'' کا لفظ علمی اور تاریخی معلومات کے لئے ہوتا ہے، نہ کہ افسانوی معلومات کے لیے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہر مذہب میں مختلف پہلوؤں سے اس قسم کا غیر علمی انداز عام ہو رہا ہے۔ ایسا انداز عقیدت مندوں کو خوش کر سکتا ہے مگر وہ جدید ذہن کو مطمئن کرنے والا نہیں۔

یہاں کثرت سے اس قسم کے تجربات اور مشاہدات ہوئے۔ میں نے سوچا کہ برادران وطن سیکڑوں سال سے توہماتی عقائد اور روایات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر مسلمان ان کی ہدایت کے لئے نہیں تڑپے۔ ان کی خیر خواہی نے انہیں بے چین نہیں کیا۔ خود ہندوؤں میں ایسے لوگ اٹھے جنھوں نے محدود طور پر اصلاح کی کوششیں کیں۔ مثلاً کبیر نے اس سلسلہ میں بہت سی باتیں کہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

ماتھے تِلک ہاتھ مَلبانا لوگن رام کھلونا جانا

آریہ سماج کی تحریک بھی اسی نوعیت کی ایک ادھوری تحریک تھی۔ گرونانک کی تحریک اپنی اصل نوعیت کے اعتبار سے غیر خداؤں کی پرستش کے بجائے ایک خدا کی پرستش کا پیغام تھا۔ اقبال نے گرونانک کے بارے میں یہ شعر کہا تھا:

نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا   میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

مسلمانوں کے پاس محفوظ آسمانی کتاب کی صورت میں کامل سچائی موجود تھی مگر مسلمان برادران وطن کی اصلاح کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ رشی کیش میں گفتگو کے دوران بہت سے ہندوؤں نے مجھ سے اسلام کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی حقیقی اصلاحی کوشش کے لئے گہری خیر خواہی درکار ہوتی ہے۔ وہ خیر خواہی جو شکایتوں کے باوجود نہ ٹوٹے، بیٹے کے ساتھ ماں کی محبت کی طرح جو ہر حال میں قائم رہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر برادران وطن کے لئے اس قسم کی خیر خواہی موجود نہ تھی۔ مسلم سلطنت کے دور میں وہ ہندوؤں کو کمتر سمجھتے رہے اور ۱۹۴۷ کے بعد وہ ہندوؤں سے اپنے سینہ میں نفرت اور شکایت لئے ہوئے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ کبھی اصلاح و دعوت کا کوئی گہرا کام نہیں کر سکتے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں مسلم صوفیوں نے ضرور کچھ مفید کام کئے مگر جہاں تک مسلم علماء کا تعلق ہے، وہ اس سلسلہ میں کوئی قابل قدر خدمت انجام نہ دے سکے۔ کچھ لوگوں نے ہندستان کو دارالحرب بتا کر مسلمانوں کے اندر منفی نفسیات پیدا کیں۔ کچھ لوگوں نے ہندوؤں کے ''مسلم ملچھ'' کے تصور کا مقابلہ کرنے کے لیے ''ہندو کافر'' کا نظریہ پھیلایا۔ کچھ لوگوں نے بت شکنی کے نام پر ایسے کام کئے جو اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف دل شکنی کے ہم معنٰی تھے۔

حال میں پاکستان نے اس فرقہ وارانہ تناؤ کو آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ اس نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے ہندو نفرت کا عالمی کارخانہ کھول دیا۔ اُس نے ہندستان کے خلاف اپنی قومی جنگ کو اسلامی جہاد کا نام دیا۔ اسی معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ اس نے ہندستان سے امکانی جنگ کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ میزائل بنائے تو ان کے نام غوری میزائل، غزنوی میزائل اور ابدالی میزائل رکھ

دئے۔ یہ نام بلاشبہہ سخت اشتعال انگیز ہیں۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ساری مسلم دنیا میں کوئی بھی عالم یا غیر عالم نہیں جو پاکستانی رہنماؤں سے یہ کہے کہ تم اپنی قومی لڑائی کو انتہائی ناعاقبت اندیشانہ طور پر یہ مجرمانہ رنگ دے رہے ہو کہ ہندوؤں کی مسلم نفرت یا اسلام نفرت اس حد تک بڑھ جائے کہ وہ معتدل ذہن کے ساتھ اسلام کے پیغام کو سننے کے قابل ہی نہ رہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میرے بچپن کے زمانہ میں کچھ علماء نے ''تبلیغ'' کے نام پر مناظرہ بازی کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ حالانکہ اس قسم کی مہم کو تبلیغ کے بجائے اینٹی تبلیغ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

مثلاً ایک مناظر عالم کو جوش آیا۔ انہوں نے ایک کتاب تیار کی جس کا نام انہوں نے ''کفر توڑ'' رکھا۔ اس کے جواب میں ایک ہندو مناظر نے کتاب شائع کی جس کا نام تھا ''کفر توڑ کا بھانڈا پھوڑ''۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو زبان عمومی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترک زبان تھی۔ گویا داعی اور مدعو کے درمیان وہ لسانی بعد (language gap) موجود نہ تھا جو آج پایا جاتا ہے۔ مگر اس سنہری زمانہ کو خیر خواہانہ دعوت کے بجائے مناظرہ بازی کے لیے استعمال کیا گیا جو صرف یہ کر سکتا تھا کہ برادران وطن کو متنفر کر کے انہیں اسلام سے کچھ اور دور کر دے۔ اس قسم کی کوششوں نے یہی کارنامہ انجام دیا۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا: ''اسلام ہندوازم کی ایک شاخ ہے۔ ہندوازم اصل ہے اور اسلام اور دوسرے مذاہب اس کی برانچ''۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کون اصل ہے اور کون برانچ۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ مختلف مذاہب میں کون سا مذہب زیادہ مستند اور قابل اعتماد ہے۔

۲ جون کی صبح کو ناشتہ پر مسٹر پرکاش ہندوجا اور ان کے ساتھی سے ملاقات ہوئی۔ ہندوجا برادرس کا کاروبار اتنا بڑا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ۵۰ برلا اکٹھا کئے جائیں تو ایک ہندوجا بنتا ہے۔ ان سے تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ مگر عجیب بات ہے کہ میرے کسی بھی سوال کا منطقی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ وہ ہر سوال کے جواب میں ایک غیر متعلق بات کہہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ گفتگو کسی نتیجہ پر نہ پہنچی۔ مثلاً میں نے کہا کہ آپ اسلام کو سمجھنے کے لیے خود اسلام کو دیکھئے، نہ کہ موجودہ مسلمانوں کو۔ مگر یہ فرق ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے اپنے تجربہ میں اکثر یہ پایا ہے کہ جو لوگ کسی مادی شعبہ میں بہت زیادہ کامیاب ہوتے ہیں وہ اپنے مخصوص شعبہ کے علاوہ دوسرے معاملات میں تفکیری انداز سے سوچ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنی ساری فکری صلاحیت کو صرف ایک پسندیدہ رخ پر مرتکز کر دیتے ہیں۔ اس لئے ایک مخصوص شعبہ میں تو ان کی معلومات بہت زیادہ ہوتی ہیں مگر دوسرے شعبہ میں ان کی واقفیت بقدر ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

یہاں انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس کا شمارہ ۲ جون ۲۰۰۲ دیکھا۔ اس میں ایک سبق آموز رپورٹ تھی۔ یہ رپورٹ اخبار کے ہفتہ وار کالم انٹرویو آف دی ویک (Interview of the Week) کے تحت چھپی تھی۔ مسٹر یشونت راج نے مشہور لیڈر نٹور سنگھ سے انٹرویو کر کے یہ رپورٹ تیار کی۔

اخباروں میں یہ خبر آچکی ہے کہ مسٹر نٹور سنگھ کے یہاں دو زبردست خاندانی حادثے ہوئے۔ ان کی بہو نتاشا نے مارچ ۲۰۰۲ میں اور ان کی بیٹی ریتو نے اپریل ۲۰۰۲ میں خودکشی کر لی۔ یہ مسٹر نٹور سنگھ کے لیے بڑا سخت حادثہ تھا۔ اس کے بعد کانگریس کی صدر مسز سونیا گاندھی ان کے یہاں تعزیت کے لئے گئیں۔ مسز سونیا گاندھی جب وہاں پہنچیں تو اس وقت مسٹر نٹور سنگھ اپنے گھر کے کمرۂ مطالعہ (study) میں تھے۔ یہاں کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہر طرف دکھائی دیتی تھیں۔

غمزدہ نٹور سنگھ نے رپورٹر سے کہا کہ سونیا گاندھی جب یہاں آئیں تو میں اپنی اسٹڈی میں تھا جہاں تقریباً دس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ میں نے سونیا سے کہا کہ یہاں ساری دنیا کی حکمت و دانش موجود ہے، مختلف ادوار کی حکمت و دانش کا خلاصہ۔ مگر یہاں ایک بھی کتاب ایسی موجود نہیں جس کو پڑھ کر میں تسکین حاصل کر سکوں:

> Within an hour of my daughter taking her life, Sonia came to see us. We were in our study upstairs—where I have close to 10,000 books. I told her, here you have the wisdom of the world, wisdom of the ages in concentrated form, but there is not a book I could pick up to console myself. (p. 14)

اسی اخبار میں صفحہ ۱۰ پر ایک اور سبق آموز رپورٹ تھی جس کا عنوان تھا — نصیحت نہ کرو بلکہ تعلیم دو:

Don't preach, just teach.

۲ جون کی صبح کو ۱۰ بجے یہاں کے وسیع ہال میں ایک جلسہ تھا۔ اس میں گانے بجانے کے پروگرام کے علاوہ ایک خصوصی پروگرام تھا۔ وہ بھگوت کتھا (کرشن کتھا) کا پروگرام تھا۔ اس پروگرام کو شری کانت ویاس نے کیا۔ وہ بھگوت کتھا کے اکسپرٹ مانے جاتے ہیں۔

اس پروگرام میں مجھے اسٹیج پر بٹھایا گیا تھا۔ ہال کے اندر بڑی تعداد میں مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ ہر ایک خوشی سے سرشار دکھائی دیتا تھا۔ مگر میرا حال یہ تھا کہ میں شدید غم کی وجہ سے مسلسل رو رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر رہا تھا کہ خدایا، یہ لوگ میرے وطنی بھائی ہیں۔ تو ان کے لئے ہدایت کے دروازے کھول دے، تو ان کو جنت کا مسافر بنا دے۔

ایک بات کو سوچ کر میرا دل ہمیشہ تڑپ اٹھتا ہے۔ ہندستان کے مسلم علماء اور مسلم دانشور عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ظلم اور تعصب کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس ملک میں ہمارے لئے جو سب سے بڑی مصیبت پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت اور تناؤ کا ماحول قائم ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ معتدل فضا میں کھلی بات چیت (open dialogue) کیا جا سکے۔ مسلمان ایک عالمی مشن کے حامل ہیں۔ اس اعتبار سے سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے درمیان آزادانہ ڈائیلاگ کے مواقع موجود ہوں۔ مگر مسلم رہنماؤں اور مسلم دانشوروں کی نا قابل فہم نادانی کی بنا پر سب سے زیادہ ملک میں اس مطلوب چیز کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمانوں کے اوپر لازم ہے کہ وہ یک طرفہ صبر واعراض کے ذریعہ دوبارہ ایسا ماحول قائم کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل معافی نہ ٹھہریں گے، خواہ انہوں نے شاندار مسجدیں بنا رکھی ہوں اور بظاہر ان مسجدوں کو نمازیوں سے بھر دیا ہو۔

شری کانت ویاس کو کتھا کرنے کی خصوصی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی کتھا میں بہت سی عوام پسند باتیں کہیں۔ انہوں نے کہا کہ چاہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کرشن کے بنا بھی کام چل سکتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ کرشن کے بنا کام ہی نہیں چل سکتا۔ اپنے اس نظریہ کے ثبوت کے لیے انہوں نے ایک مثال دی۔ انہوں نے کہا کہ آپ سبزی لینے کے لیے بازار جائیں۔ آپ کی چاہ یہ تھی کہ آپ پرول لیں گے۔ لیکن اگر بازار میں پرول نہ ہوتو آپ بھنڈی یا کوئی بھی سبزی لے کر واپس آجائیں گے۔ لیکن اگر آپ کے گھر میں ایک مریض ہے اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس کو انار کھلاؤ۔ اب اگر آپ انار لانے کے لیے بازار جائیں اور ایک دکان پر انار نہ ہوتو آپ دوسری دکان پر جائیں گے۔ یہاں تک کہ انار حاصل کرنے کے لئے پورا بازار چھان ماریں گے۔

انہوں نے کہا کہ آج کل لکھ پتی اس کو سمجھا جاتا ہے جس کے پاس لاکھ روپیہ ہو اور کروڑ پتی اس کو سمجھا جاتا ہے جس کے پاس کروڑ روپیہ ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ لکھ پتی وہ ہے جو لاکھ بار کرشن کا نام لے اور کروڑ پتی وہ ہے جو کروڑ بار کرشن کا نام لے۔ میں نے دیکھا کہ مقرر کے اس قسم کے الفاظ کو سن کر حاضرین جوش سے بھر جاتے تھے۔ حالانکہ اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف الفاظ کا کھیل ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ الفاظ کا یہ کھیل خود مسلمانوں میں بھی اتنا ہی پایا جاتا ہے جتنا کہ دوسرے لوگوں میں۔

انہوں نے کہا کہ گیتا میں ایک بہت بڑی بات کہی گئی ہے۔ مہابھارت میں جب ارجن لڑائی کے لئے آگے بڑھنے سے ہچکچا رہے تھے تو کرشن نے ان کو اکساتے ہوئے کہا کہ تم سوچتے ہو کہ میں ان زندہ لوگوں کو کیسے ماروں۔ مگر میں تم کو بتاتا ہوں کہ یہ مرتے نہیں، بلکہ یہ تو چولا بدلنا ہے۔ یہ سن کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ چولا بدلنے کا یہ نظریہ اگر کسی سماج میں عام ہو جائے تو اس سماج کا کیسا عجیب حال ہوگا۔ وہ میری اس بات کو سن کر مسکرا دیے۔

۲ جون کی شام کو خصوصی پروگرام تھا۔ اس پروگرام کے لیے عین گنگا کے اوپر ایک بہت بڑا رنگارنگ پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ بہت سی کشتیوں کے اوپر اس پلیٹ فارم کو قائم کیا گیا تھا۔ اس کے اوپر

بڑی تعداد میں لوگ خصوصی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس پلیٹ فارم میں ذرا بھی جنبش نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ ماہر تیراکوں کی مدد سے گنگا کی تہہ میں بڑے بڑے پتھر جمائے گئے ہیں۔ ان پتھروں کے اوپر بہت سے کھمبوں کو جمایا گیا اور پھر اس کے اوپر خصوصی تکنیک کے ذریعہ مسطّح منچ سجایا گیا تھا۔ اب تک لوگ گنگا کے ساحل پر گنگا کی پوجا کیا کرتے تھے۔ یہاں جدید تکنیک کو استعمال کر کے ایسا منچ بنایا گیا جس کے نیچے گنگا موجیں مارتی ہوئی بہہ رہی تھی اور اس کے اوپر گنگا پوجا کے پروگرام پرسکون طور پر جاری تھے۔

شام کے پروگرام کے درمیان مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ منچ کے ایک حصہ میں کچھ جگہ خالی تھی۔ یہاں کھڑے ہو کر میں نے مغرب کی نماز پڑھی۔ لوگوں کے بیان کے مطابق، وہاں موجود کیمرہ مین نے میری نماز کا فوٹو بھی لے لیا۔ میرے لئے یہ ایک بڑا عجیب تجربہ تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس منچ کے اوپر لوگ گنگا کی پرستش کے لئے اکٹھا ہوئے تھے۔ وہاں میں نے لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر خالق گنگا کی عبادت اور پرستش کا فریضہ انجام دیا۔

شام کے اس پروگرام میں اترانچل کے چیف منسٹر نارائن دت تیواری آ کر شریک ہوئے۔ وہ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ آئے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ شام کے اس فنکشن میں ۷ بجے گنگا آرتی کا پروگرام تھا جس کو چیف منسٹر انجام دینے والے تھے۔ مگر چیف منسٹر کے لیٹ آنے کی وجہ سے گنگا آرتی کا یہ پروگرام دیر سے ہوا۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ اس زمانہ میں چیف منسٹر کا درجہ بھگوان سے بھی زیادہ بڑا ہے۔

نارائن دت تیواری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے تقریر کی۔ میں نے پہلی بار ان کی تقریر سنی۔ وہ اگرچہ ایک تجربہ کار سیاست داں سمجھے جاتے ہیں۔ مگر جہاں تک تقریر کا تعلق ہے، وہ مجھے کوئی اچھے مقرر نظر نہیں آئے۔ انھوں نے اپنی تقریر کے آغاز میں کہا کہ میں یہاں مکھیہ منتری کے روپ میں نہیں آیا ہوں بلکہ میں یہاں مکھیہ سیوک کے روپ میں آیا ہوں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں گنگا کے پانی کی صفائی پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہری دوار سے لے کر گنگوتری تک گنگا کی صفائی کے لئے جو بھی

پروگرام بنایا جائے گا اس میں اترانچل گورنمنٹ پوری مدد کرے گی۔

شام کے پروگرام کے خاتمہ پر عشاء کی نماز باجماعت ادا کی گئی۔ میں نے اس کی امامت کی۔ جماعت میں کل چھ آدمی شریک تھے۔ ان میں سے دو ہندو (آر۔ ملہوترا، پی۔ ملک) تھے۔ اس قسم کی باجماعت نماز بھی شاید پہلی بار رشی کیش میں پڑھی گئی ہو۔ میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ہندوؤں نے میرے پیچھے جماعت میں شریک ہو کر نماز پڑھی۔

۲ جون کو شام کا کھانا ایک ایسے مقام پر کھایا گیا جو عین گنگا کے کنارے واقع تھا۔ ہم لوگ ایک میز کے چاروں طرف کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف گنگا ہلکی موسیقی کے ساتھ مسلسل بہتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے آگے دوسری طرف ہمالیہ پہاڑ پھیلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کے اوپر کھلا آسمان اور پھر خالص ہوا کے خوشگوار جھونکے۔ یہ ایک آفاقی منظر تھا جو فطرت کے ناقابل بیان کائناتی حُسن کی یاد دلا رہا تھا۔

میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کو قرآن کی ایک آیت سنائی: **یوم تبدل الارض غیر الارض** (ابراہیم ۴۸) یعنی جب ارض کو بدل کر غیر ارض کر دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اس آیت میں تبدیلی سے مراد غالباً وہی چیز ہے جس کو کنورژن (conversion) کہا جاتا ہے۔ کنورژن فطرت کا عالمی اصول ہے۔ یہاں ہر چیز کنورژن کے عمل (process) سے گزر کر ارتقا یافتہ صورت اختیار کرتی ہے۔ مثلاً لوہا (ore) بدل کر ایک بامعنٰی انجن بن جاتا ہے۔ مٹی اور معدنیات بدل کر خوراک کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہماری پوری دنیا آخر میں ایک سپر کنورژن (super conversion) کے عمل سے گزرے گی اور پھر وہ زیادہ بہتر اور کامل دنیا وجود میں آئے گی جس کو آخرت کی دنیا کہا گیا ہے۔

مختلف اوقات میں کھانے کی میز پر جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے ایک ریٹائرڈ جسٹس گردھر مالوی تھے۔ وہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے بانی مدن موہن مالوی کے پوتے ہیں۔ انہوں نے ملاقات کے دوران کئی باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے دادا نے بنارس یونیورسٹی کو ایک قومی

یونیورسٹی کے طور پر بنایا تھا۔ وہاں ملک کے ہر اسٹیٹ کے لیے کوٹا مقرر تھا۔ حیدرآباد کا بھی ایک کوٹا تھا۔ چنانچہ حیدرآباد کے طلبہ کے لئے وہاں ایک نظام کالونی بنائی گئی تھی جو ابھی تک موجود ہے۔

انہوں نے کئی دلچسپ واقعات بتائے۔ مثلاً انہوں نے بتایا کہ ایک بار مدن موہن مالوی ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ محمد علی اور شوکت علی بھی تھے۔ نماز کا وقت آیا تو علی برادران نے نماز پڑھنے میں دیر کی۔ اس پر مدن موہن مالوی نے یاد دلایا کہ آپ کی عبادت کا وقت آ گیا اور ابھی تک آپ نے نماز نہیں پڑھی۔

اگر آپ مدن موہن مالوی کی تصویر دیکھیں اور اس کے نیچے ان کا نام لکھا ہوا نہ ہو تو آپ یقین نہیں کرسکیں گے کہ یہ کسی ہندو کی تصویر ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے چہرے پر شاندار داڑھی ہے اور ان کا لباس بھی مسلم لباس ہے۔ اسی لیے ایک اُردو شاعر نے کہا تھا:

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی　　　مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

یہ وہ دور تھا جب کہ مسلم کلچر کا غلبہ ملک میں قائم تھا۔ مدن موہن مالوی ایک پنڈت تھے مگر ان کی وضع قطع ایسی تھی کہ ان کو دیکھ کر بظاہر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ پنڈت مدن ہیں یا مولوی مدن۔ دوسری زبانوں کے ساتھ وہ عربی اور فارسی زبان بھی جانتے تھے۔

۲ جون کو ایک مجلس میں میں نے سورہ والعصر کی تشریح کی۔ میں نے بتایا کہ قرآن میں انسان کی زندگی کو زمانہ (ٹائم) سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ جس طرح ٹائم ہر لمحہ گھٹتا رہتا ہے اسی طرح انسان ہر دن اپنی زندگی کی مقرر مدت کو کم کرتا ہوا موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح برف پگھل کر ہر لمحہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ہر آدمی کا کاؤنٹ ڈاؤن (count down) ہو رہا ہے۔ ایک آدمی کی کل عمر اگر تقدیر میں دس ہزار دن کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ یعنی آج اگر اس کی مدت عمر دس ہزار دن تھی تو کل اس کی عمر ۹۹۹۹ دن ہو جائے گی۔ اگلے دن ۹۹۹۸ دن اور اس کے بعد ۹۹۹۷ دن، **وقس علی هذا**۔

رشی کیش پہلے یوپی کا ایک ٹاؤن تھا۔ اب وہ نئی اسٹیٹ اترانچل کا ایک حصہ ہے۔ رشی کیش

ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے۔ اس کے ایک طرف ہمالیہ کی پھیلی ہوئی چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں اور دوسری طرف گنگا کا پانی ہلکی موسیقی کے ساتھ بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں ہر طرف فطرت کا آفاقی ماحول ہے۔ پورا رشی کیش اسی طرح فطرت کی گود میں بسا ہوا ہے۔

یہاں کا پروگرام ہندی زبان میں چھپا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ میرے لیے ان کو سمجھنا مشکل تھا۔ ۲ جون کو مجھے ایک پروگرام میں لے جایا گیا۔ یہاں گنگا کے کنارے مخصوص سجے ہوئے منچ پر گدی کی نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ ان گدیوں پر ممتاز مہمان بٹھائے گئے تھے۔ مجھے بھی لے جا کر وہاں ایک گدی پر بٹھا دیا گیا۔ میری تمام تر دلچسپی اس وقت یہ تھی کہ میں یہ جانوں کہ ہندو دھرم کیا ہے اور اس کے رسم ورواج کیا ہیں۔ یہاں پہلے باجے کے ساتھ بھجن گایا گیا۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد تمام لوگ ایک ایک تھال لے کر کھڑے ہو گئے جس میں کچھ روایتی چیزیں تھیں اور دئے جل رہے تھے۔ لوگوں نے کھڑے ہو کر مخصوص انداز میں اس کو گھمانا شروع کر دیا۔ یہ گنگا پوجا کی رسم تھی۔ میں نے سادہ طور پر یہ کیا کہ میں بدستور اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس طرح میں نے اپنے منصوبہ کے مطابق، گنگا پوجا کا معائنہ تو کیا مگر میں نے اپنے آپ کو اس میں شرکت سے بچائے رکھا۔

۳ جون کی صبح کو فجر کی نماز کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر آیا۔ یہاں درختوں کے سایہ میں لمبا پختہ راستہ بنا ہوا تھا۔ یہاں میں اپنا جوتا اتار کر ننگے پاؤں ٹہلنے لگا۔ تازہ ہوا میں ٹہلنا ایک بے حد فرحت بخش تجربہ ہے۔ اسی کے ساتھ اگر ننگے پاؤں ٹہلنا ہو تو تاثیر اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ پیدل چلنے میں لمسِ فطرت (contact with nature) کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ تجربہ اس وقت نہیں ہو سکتا جب کہ آدمی جوتا اور موزہ پہن کر چل رہا ہو۔

یہاں جین مذہب کے کئی لوگ آئے ہوئے تھے۔ ایک جینی پیشوا جو اپنے منہ پر پٹّی لگائے ہوئے تھے ان سے گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ مندر بنانا چھوڑو، انسان بناؤ۔ میں نے پوچھا کہ انسان بنانے کا فارمولا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اپنی

خواہشوں (desires) کو ہلاک کرنا۔ انہوں نے بتایا کہ جینی طریقہ کے مطابق، منہ پر پٹّی باندھنا اسی باپرہیز زندگی کی ایک علامت ہے۔

میں نے کہا کہ دوسرے لفظوں میں، آپ کا نظریہ سلف کنٹرول کا نظریہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کوئی شخص سلف کنٹرول کیوں کرے۔ کوئی شخص اپنی طاقتور خواہشوں کو کیوں دبائے۔ انسان کو سلف کنٹرول پر آمادہ کرنے کے لیے ایک زیادہ بڑا محرک درکار ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے انہیں اسلام کے نظریۂ جنت سے متعارف کرایا۔

رشی کیش میں ایک ادارہ ہے جس کا نام یہ ہے — اسٹریٹیجک مینیجمنٹ سروسز (SMS)۔ اس کے نمائندے (مسٹر انل نائر اور شیوساگر چوپڑا) وغیرہ ۳ جون کو میرے کمرے میں آئے اور کہا کہ ہمیں آپ کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کرنا ہے۔ وہ ایجوکیشن اور اخلاقی سدھار کے بارہ میں میرے خیالات ریکارڈ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ بلاشبہہ ہمارے دیش کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ مگر میں اپنے تجربہ کے مطابق، اس کو نہیں مانتا کہ تعلیمی نصاب کو بدل کر یا ہسٹری کو دوبارہ لکھ کر یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ مسئلہ کا حل ہوتا تو اب تک مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔ کیوں کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہماری ہر گورنمنٹ اسی مقصد کی بنیاد پر نصاب میں تبدیلی کرتی رہی ہے۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس کا کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک میں تعلیمی اصلاح کے نام سے بہت سے ادارے قائم ہیں۔ مثلاً شانتی نکیتن اور گروکل وغیرہ، مگر یہ سب بے نتیجہ رہے۔

اسی طرح انگریزوں کی مثال بھی ہے۔ لارڈ میکالے کی سفارشات کے تحت برٹش گورنمنٹ نے ملک میں ایک ایسا انگریزی تعلیمی نظام جاری کیا جس کے متعلق اُن کا اندازہ یہ تھا کہ ہندستانیوں کے خیالات اس طرح بدل جائیں گے کہ وہ ہمیشہ کے لیے برٹش حکومت کی ماتحتی قبول کرلیں گے۔ مگر اس کا نتیجہ بالکل الٹا نکلا۔ اسی انگریزی نظام تعلیم سے وہ تمام لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف فریڈم موومنٹ کی قیادت کی۔

پھر میں نے کہا کہ میں تعلیم برائے تعلیم (education for the sake of education)

کا قائل ہوں۔ میرا نظریہ ہے کہ تعلیم کے نظام کو خالص فنی بنیاد پر چلانا چاہئے۔ جہاں تک اخلاق اور کریکٹر کی بات ہے تو اس کام کے لئے زیادہ موثر طریقہ وہ ہے جس کو غیر رسمی تعلیم (informal education) کہا جاتا ہے۔ ہم خود ۴۰ سال سے اسی کام کو کر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمارے مشن کے ذریعہ ہزاروں لوگوں کے اندر ذہنی اور اخلاقی انقلاب آیا ہے۔

۳ جون کو ناشتہ اور کھانے کی میز پر کئی لوگوں سے ملنے کا اور گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہمارے ساتھ نو آدمی تھے۔ ان میں سے ۳ فارنر تھے۔ ان لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہیں روحانیت کا وہ تجربہ ہوا ہے جس کو وجد (ecstasy) کہا جاتا ہے۔ میں نے مختلف سوالات کرکے یہ جاننا چاہا کہ وجد کیا ہے۔ مگر وہ لوگ بار بار یہی کہتے رہے کہ وجد ایک اندرونی کیفیت ہے جس کو لفظوں کے ذریعہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ گفتگو کے آخر میں انہوں نے کہا کہ اب آپ بتائیے کہ وجد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ جو لوگ وجد کی اصطلاح میں روحانیت کی بات کرتے ہیں وہ صرف ایک مصنوعی یا غیر حقیقی تجربہ کو حقیقی سمجھنے کی غلطی کر رہے ہیں۔ میں نے قرآن کی آیت والذین آمنوا اشد حبا للہ (البقرہ ۱۶۵) کی روشنی میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر فطری طور پر اپنے خالق (خدا) کے لیے بے پناہ جذبۂ محبت موجود ہوتا ہے۔ ہر آدمی خود اپنی فطرت کے زور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ اس مرکزِ محبت کو پالے جس سے وہ اپنے اعلیٰ جذبات کو وابستہ کر سکے۔

موجودہ حالات میں خدا کا تصور لوگوں پر واضح نہیں ہے۔ خاص طور پر آریائی مذاہب (Aryan Religions) میں خدا کا عقیدہ وحدت وجود (monism) کے تصور پر مبنی ہے۔ اس تصور میں خدا ہم سے علیحدہ کوئی مستقل وجود نہیں۔ وہ ایک غیر متشخص قسم کا مجرد تصور (abstract idea) ہے۔ اس لئے جو لوگ آریائی روایات میں پرورش پا کر نکلے ہیں وہ عملاً ایسے کسی شخصی خدا سے روشناس نہیں ہوتے جس کو وہ اپنا مرکز محبت بنائیں اور اس کے ذریعہ ان کے اندر وجد کی کیفیت پیدا ہو۔ اس لئے وہ خودساختہ ورزشوں کے ذریعہ اپنی ایک مفروضہ دنیا بناتے ہیں اور اس کو وجد سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا وجد حقیقۃً ایک فطری حقیقت کا غیر حقیقی انتساب (attribution) ہے، نہ کہ حقیقی مرکز محبت سے مربوط

ہونے کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا تجربہ۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے بات کرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ ان کے دل میں اسلام کے خلاف سخت نفرت ہے۔ میں نے سنجیدگی کے ساتھ ان سے پوچھا کہ اسلام کے بارہ میں آپ کی وہ کون سی معلومات ہیں جن کی وجہ سے آپ کے دل میں اُس کے خلاف منفی جذبات پیدا ہوئے۔ انہوں نے چند باتیں بتائیں۔ مثلاً محمود غزنوی نے سومناتھ کے مندر کو لوٹا۔ بابر نے انڈیا پر حملہ کیا۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کے خلاف جنگ کی۔ ہندستان میں جبر کے ذریعہ اسلام پھیلایا گیا۔

میں نے کہا کہ آپ کو اسلام اور مسلمانوں کے درمیان فرق کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ہی آپ اس معاملہ میں منصفانہ رائے قائم کر سکیں گے۔ میں نے کہا کہ محمود غزنوی کا مندر کے سونے کو لوٹنا اسلام کے نزدیک بھی اتنا ہی غلط تھا جتنا کہ وہ آپ کے نزدیک غلط ہے۔ اسی طرح بابر کے حملہ کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے بابر کو یا اور کسی مسلمان کو پر امن پیغام لے کر ہندستان میں داخل ہونا چاہئے تھا، نہ کہ تلوار لے کر۔ اسی طرح اورنگ زیب نے جو کچھ کیا اس کا بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک جبری کنورژن کا تعلق ہے تو یہ صرف ایک الزام ہے اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ خود ہندو اسکالرس نے تسلیم کیا ہے کہ ہندستان میں اسلام کی اشاعت پر امن طور پر ہوئی ہے، نہ کہ جبر اور تشدد کے ذریعہ۔

رشی کیش میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی اُن میں سے ایک قابلِ ذکر شخص مسٹر ترلوچن سنگھ تھے۔ وہ نیشنل کمیشن فار مائینا رٹیز کے وائس چیرمین ہیں۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں۔ (Tel.: off-4690809, Res- 3384664)۔ وہ مجھ کو میری تحریروں سے جانتے تھے۔ گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ ایک سمجھ دار اور حقیقت پسند آدمی ہیں اور اپنے موجودہ عہدہ کے لیے پوری طرح موزوں ہیں۔

اُنہوں نے کہا کہ انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کی جو حالت ہے وہ گویا ایک قسم کی سرد جنگ (cold war) ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اس فرقہ وارانہ مسئلہ کا صرف ایک ہی مؤثر

حل ہے، اور وہ دونوں فرقوں کے درمیان سوشیلائیزیشن (socialization) ہے۔ ضرورت ہے کہ دونوں کے درمیان ملنے جلنے کے مواقع کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ ملنا جلنا اپنے آپ اس مسئلہ کا حل بن جائے گا۔

ایک اور بات اُنہوں نے یہ کہی کہ دونوں فرقوں کے صرف نرم دَل والے لوگ اگر ملیں تو اس سے مطلوب فائدہ حاصل ہونے والا نہیں۔ ضرورت ہے کہ دونوں طرف کے گرم دَل کے لوگ باہم ملیں اور تعلقات کو بڑھائیں۔ اُنہوں نے کہا کہ دونوں طرف کے انتہا پسندوں کو مل کر بیٹھنا چاہئے:

Extremists should sit.

کانفرنس کے رسمی اجتماعات میں شرکت کے علاوہ بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک ملاقات میں خدا کے وجود کا تذکرہ ہوا۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا: خدا کہیں باہر نہیں، وہ تو خود ہمارے اندر موجود ہے۔ میں نے کہا کہ بہت سے لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں مگر اس نظریہ کے حق میں کوئی علمی دلیل موجود نہیں۔ ''خدا انسان کے اندر ہے'' صرف ایک لفظی بیان ہے، وہ کوئی مدلّل بیان (reasoned statement) نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہندوازم ایک گہرے تضاد کا شکار ہے۔ ہندوازم کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان خدا کا ایک اَنش ہے۔ اس عقیدہ کو ادوئت واد کہتے ہیں۔ انسان اگر خدا کا جزء ہے تو انسان کے اندر خدا والی صفت ہونی چاہئے، مثلاً تخلیق کی قدرت۔ مگر کسی بھی دلیل سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے قطرہ اور سمندر کی مثال دی جاتی ہے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، قطرہ میں سمندر کے سارے اوصاف موجود ہیں جب کہ انسان میں کوئی بھی خدائی صفت موجود نہیں۔

اس فکری تضاد کو رفع کرنے کے لیے ہندوؤں میں دوسرا عقیدہ پیدا ہوا جس کو دوئت واد کہا جاتا ہے، یعنی خدا الگ ہے اور انسان الگ۔ اس نظریہ کی حامی ایک ممتاز شخصیت مادھو چاریہ کی ہے۔ اگرچہ ہندوؤں میں شنکر آچاریہ کا ادوئت واد زیادہ مقبول ہوا اور مادھو چاریہ کا دوئت واد زیادہ مقبول نہ ہوسکا۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے خدا کے عقیدہ پر گفتگو ہوئی۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمارا ماننا یہ ہے کہ خدا

انسان کے اندر ہے، خدا انسان کے باہر نہیں جس کو کہیں اور تلاش کرنے کی ضرورت ہو۔ میں نے کہا کہ خدا کی موجودگی کا احساس ضرور انسان کے اندر ہے۔ مگر خدا کی ذات ہمارے وجود کے باہر ہے، نہ کہ ہمارے اندر۔ اُنہوں نے کہا کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ جب خدا کا احساس ہمارے اندر موجود ہے تو یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ہمارے اندر ہے، اُس کو باہر ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔

میں نے کہا کہ خدا کا احساس اندر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ باہر موجود نہ ہو۔ اُنہوں نے کہا کہ ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہر انسان کا عام تجربہ ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ پیاس ہمارے اندر موجود ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود پانی بھی ہمارے اندر موجود ہے۔ ہر آدمی کا ذاتی تجربہ ہے کہ پیاس اگرچہ ہمارے اندر ہے مگر پانی ہم سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ آپ لوگ احساس خداوندی کو وجود خداوندی کے مفہوم میں لے رہے ہیں۔ میری یہ بات سن کر وہ کچھ دیر چُپ رہے اور کہا کہ میں اپنے گرو سے پوچھ کر کل آپ کو بتاؤں گا۔ لیکن اگلے دن اُن سے ملاقات نہ ہوسکی۔

رشی کیش کا یہ اجتماع بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ اس میں نہ صرف ملک کے بلکہ دوسرے ملکوں کے ہندو نمائندے شریک ہوئے۔ تین دن تک ہر طرف زبردست مذہبی دھوم نظر آئی ــــــ بھجن، مذہبی سنگیت، کرشن کتھا، گنگا پوجا، طرح طرح کی مذہبی رسمیں، وغیرہ۔

میں نے سوچا کہ کیا یہ حقیقی معنوں میں مذہبی دھوم ہے۔ میرے دل نے کہا کہ نہیں۔ کیوں کہ یہاں ظاہری ہنگامے تو کافی تھے مگر مذہب کی حقیقی روح نظر نہ آئی۔ ایک بوڑھے ہندو نے درد کے ساتھ کہا کہ یہاں آکر مجھے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ رنگ برنگ کے یہ پروگرام مجھے صرف تام جھام دکھائی دیتے ہیں۔ مذہب کی اصل اسپرٹ کا کہیں پتہ نہیں۔

میں نے مزید سوچا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ سب مذہب نہیں ہے بلکہ کلچر ہے۔ خود مسلمانوں کا حال بھی تقریباً یہی ہے۔ آج کل مسلمانوں میں مذہب کے نام پر کافی دھوم دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہ سب اپنی حقیقت کے اعتبار سے کلچرل اسلام کے مظاہر ہیں، نہ کہ ربّانی اسلام کے مظاہر۔ ربّانی اسلام وہ ہے جس میں معرفت کی گہرائی ہو۔ جس میں سچائی کا اعتراف ہو۔ جس میں خوف خدا کا غلبہ ہو۔ جس میں

اخلاقی اقدار زندہ ہوں۔ جس میں انصاف کی بولی بولی جائے خواہ وہ اپنے موافق ہو یا اپنے خلاف، وغیرہ۔ مگر یہی وہ چیزیں ہیں جن کا اسلام کے نام پر ہونے والے ہنگاموں میں کہیں پتہ نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اُنھوں نے میڈیٹیشن (meditation) کے فائدے بتائے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارے سماج میں سب سے بڑا پرابلم ایگو (ego) کا پرابلم ہے۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ کوئی بات اپنے مزاج کے خلاف ہو تو فوراً اُس کا ایگو بھڑک اٹھتا ہے۔ جس کا آخری نتیجہ بریک ڈاؤن (break down) ہوتا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ میڈیٹیشن کے ذریعہ ہم ایگو کو تحلیل (disolve) کردیتے ہیں۔ گویا کہ اَنا والا آدمی بے اَنا بن جاتا ہے اور پھر وہ کسی کے لیے پرابلم نہیں رہتا۔

میں نے کہا کہ یہ صرف کہنے کی ایک بات ہے۔ اَنا یا ایگو انسان کی ایک فطری صفت ہے، اُس کو میڈیٹیشن جیسی ورزشوں کے ذریعہ تحلیل یا ڈیزالو کرنا ممکن ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ ایگو انسانی دماغ کی ایک صفت ہے۔ اور میڈیٹیشن میں آپ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ ایک جسمانی ورزش (physical exercise) ہوتی ہے اور ایک دماغی صفت کو جسمانی ورزش کے ذریعہ ختم کرنا نفسیاتی اعتبار سے ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ تجربہ یہی بتاتا ہے کہ میڈیٹیشن کے پورے کورس سے گذرنے کے باوجود لوگوں کے اندر ایگو پوری طرح موجود ہوتا ہے اور جب بھی اُس کے اَنا پر چوٹ پڑے تو وہ بھڑک اُٹھتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایگو کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ البتہ اُس کو ڈیفیوز (defuse) کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کا طریقہ یہی ہے۔ اسلام آدمی کی سوچ کے اندر انقلاب لاتا ہے۔ یہ سوچ اس بات کی ضامن بن جاتی ہے کہ جب بھی آدمی کی اَنا بھڑکے تو اُس کی سوچ متحرک ہو کر اُس کی انا کے بم کو ڈیفیوز کردے۔ میں نے کہا کہ اَنا (ایگو) کوئی برائی نہیں، وہ ایک طاقت ہے۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے ذہن کو اتنا زیادہ ترقی دیں کہ وہ اَنا کو صرف اچھے استعمال میں لے، وہ اُس کو برے استعمال تک نہ جانے دے۔

ایک صحافی نے انٹرویو کے دوران سوال کیا کہ اسکول اور کالج کی تعلیم میں آج کل ریفارم کی

باتیں ہورہی ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ سوسائٹی میں جو اخلاقی بگاڑ آیا ہے اُس کو اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ تعلیمی نصاب میں اخلاق کو ایک مستقل مضمون کے طور پر شامل کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ تجربہ تو کیا جاچکا ہے۔ موجودہ تعلیمی نصاب میں بھی اکثر جگہ کسی نہ کسی طور پر اخلاقی چیزیں پڑھائی جاتی ہیں۔ شانتی نکیتن اور گروکل جیسے بہت سے تعلیمی ادارے تو خاص اسی مقصد کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ مگر اُن سے مطلوب اخلاقی نتیجہ حاصل نہ ہوسکا۔

میں نے کہا کہ تعلیم کے دو الگ الگ شعبے ہیں۔ ایک فارمل ایجوکیشن، اور دوسرے انفارمل ایجوکیشن۔ فارمل ایجوکیشن سے مراد اسکول اور کالج کی تعلیم ہے اور انفارمل ایجوکیشن سے مراد اصلاحی کوشش ہے جو رسمی تعلیم کے باہر تعمیر شعور کے لیے کی جائے۔ اخلاقی شخصیت پیدا کرنے کے لیے انفارمل ایجوکیشن مفید ہے، نہ کہ صرف فارمل ایجوکیشن۔

اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ فارمل ایجوکیشن میں سارا زور نمبر پر ہوتا ہے۔ طالب علم کی آخری کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ امتحان کے موقع پر کسی نہ کسی طرح زیادہ نمبر لائے تاکہ وہ امتحانی اصطلاح میں کامیاب ہوسکے۔

بہائی مذہب کے ایک صاحب بھی یہاں آئے تھے۔ اُنہوں نے ''یونیورسل مذہب'' کے موضوع پر اپنی مختصر تقریر کی۔ اُنہوں نے آٹھ صفحہ کا ایک پمفلٹ (اپریل ۲۰۰۲) تقسیم کیا۔ یہ بہائی عالمی مرکز کے بیت العدل اعظم کی طرف سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ پمفلٹ عمدہ کاغذ پر نہایت عمدہ چھپا ہوا تھا مگر پورا پڑھنے کے باوجود اُس کا کوئی خلاصہ میری سمجھ میں نہ آسکا۔ اُس کا ایک اقتباس یہ تھا:

''۱۸۹۳ء میں مشہور عالمی کولمبیائی اجلاس (شکاگو) نے ''مذہبی پارلیمنٹ'' کو وجود میں لاکر سب کو حیران کر دیا۔ روحانی اور اخلاقی اشتراک کی اس استصواب رائے نے تمام براعظموں کی توجہ مبذول کرائی اور اُس نے سبھی سائنسی، تکنیکی اور تجارتی کامیابیوں سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ تھوڑے عرصہ کے لیے لگا کہ پابندیوں اور قدامت پرستی کی دیواریں گر گئیں۔ مؤثر مفکرین کے لیے بھی یہ اشتراک انوکھا اور تاریخ عالم میں اہمیت کا حامل تھا۔

’’مذہبی پارلیمنٹ‘‘ کے منتظمین نے کہا کہ ’’مذہبی پارلیمنٹ‘‘نے دنیا کو مذہبی جنون سے بچالیا‘‘۔

یہ میرے نزدیک ایک خیالی بات ہے۔ عالمی انقلاب کبھی کسی جلسہ یا سیمینار کے ذریعہ ظہور میں نہیں آتا۔ اس قسم کا جلسہ صرف ایک مظاہرہ ہے۔ انسانوں کے درمیان کوئی حقیقی انقلاب لانے کے لیے ایک مسلسل فکری تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کا انقلاب ہمیشہ طویل فکری جدوجہد کے ذریعہ آتا ہے، نہ کہ وقتی قسم کے مظاہروں سے۔

بہائی مذہب کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ بہائی لوگوں کے درمیان آپس میں سلام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں: اللہ ابہیٰ (God is most glorious)۔ واضح ہو کہ بہائی مذہب کے بانی کا نام بہاء اللہ تھا۔

رشی کیش میں ایک اور بات معلوم ہوئی جس کا ابھی تک مجھے علم نہ تھا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے پان اسلام ازم کی طرح ہندوؤں میں ایک عالمی تحریک پان ہندوازم کے نام پر چل رہی ہے۔ اس کا مقصد تمام دنیا کے ہندوؤں کو متحد کرنا ہے جن کی تعداد تقریباً ایک ارب بتائی جاتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہوا، یہ تحریک تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ مثلاً یہاں پُرتگال کے ایک ہندو لیڈر ملے۔ اُنھوں نے بتایا کہ پرتگال میں بسنے والے تمام ہندوؤں کو اُنھوں نے ایک اتحاد میں جوڑ دیا ہے۔

موجودہ ہندوؤں کے ذہن میں یہ خیال ڈالا جارہا ہے کہ مستقبل میں ہندوؤں کے لیے خطرہ عیسائیت وغیرہ سے نہیں ہے بلکہ صرف اسلام سے ہے۔ اس لیے اپنے خیال کے مطابق، وہ ہر قیمت پر اسلام کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں کچھ ایسے ہندوؤں سے ملاقات ہوئی جو عربی اور فارسی زبانیں بے تکلف بولتے تھے۔ میں نے ایسے ہی ایک ہندو سے کہا: حال شما چیست۔ اُس نے خالص ایرانی لہجہ میں اس کا جواب دیا۔

رشی کیش کے اس عالمی اجتماع کو کنڈکٹ کرنے یا چلانے کا کام ایک ۳۵ سالہ خاتون کررہی تھیں۔ وہ ایک امریکن خاتون تھیں۔ مگر انھوں نے ہندو مذہب کو اپنالیا تھا اور اب اُن کا نام بھاگوتی تھا۔ وہ سفید رنگ کی ساڑی پہنے ہوئی تھیں اور انتہائی پھرتی کے ساتھ تمام پروگرام کو چلارہی تھیں۔

اجلاس کے دوران اُنہوں نے انگریزی میں بولتے ہوئے مجھے تقریر کے لیے مدعو کیا۔ میں نے سادہ اُردو زبان میں اپنی تقریر کی۔ تقریر کے بعد وہ میرے پاس آئیں اور میری تقریر پر اچھے تأثر کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ یہاں جو لوگ اکٹھا ہیں اُن کی اکثریت ہندی سمجھتی ہے اس لئے میں نے اپنی تقریر ہندی زبان میں کی۔ میں نے اُن سے یہ بات انگریزی میں کہی تھی۔ اس کو سن کر انہوں نے امریکی لہجہ میں کہا:

مولانا صاحب، میں ہندی سمجھتی ہوں۔

رشی کیش میں جو نئی باتیں معلوم ہوئیں اُن میں سے ایک یہ تھی کہ سنسکرت پاٹھ شالاؤں میں ایک مستقل شعبہ ہوتا ہے جس کو کتھا کاریتا کہتے ہیں۔ اس شعبہ میں خصوصی تربیت کے ذریعہ کتھا کار تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کرشن کتھا اور رام کتھا جیسے پروگرام کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی تقریروں کو قصے کہانیوں اور لطیفوں اور مختلف اداؤں کے ساتھ اتنا دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ سننے والے گھنٹوں دلچسپی کے ساتھ اُس کو سنتے رہتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے بتایا کہ اُن کی تقریر کے دوران ایسے بھی لمحات آتے ہیں جب کہ لوگ باقاعدہ رونے لگتے ہیں۔ کبھی اُن پر وجد (ecstacy) کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ یہ کتھا کار کئی کئی گھنٹے مسلسل بولتے ہیں، مگر اُن کی آواز میں فرق نہیں آتا۔ اُن کے گلے کی طاقت بدستور یکساں طور پر موجود رہتی ہے۔ ان لوگوں کو ہر کتھا پر بڑی بڑی رقمیں ادا کی جاتی ہیں۔

کتھا کار کی ایک خصوصیت پر مجھے بہت تعجب تھا۔ وہ یہ کہ مسلسل کئی گھنٹہ تک بولنے کے باوجود اُن کی آواز خراب کیوں نہیں ہوتی۔ ایک انگریزی صحافی نے اس کا راز بتایا۔ اُنہوں نے کہا کہ یہاں میں کتھا کار سے ملا اور اُن سے دوسری باتوں کے ساتھ ان کے گلے کی طاقت کا راز بھی دریافت کیا۔ کتھا کار نے کہا کہ یہ سب ہمارے گرو کی کرپا ہے۔ کتھا کار نے مذکورہ جرنلسٹ کو ایک پُڑیا دکھائی اور کہا کہ یہ ہمارے گرو کی دی ہوئی ہے اور اس کا نام مسٹیریس پاؤڈر (mysterious powder) ہے۔

جرنلسٹ نے پڑیا کھول کر پاؤڈر کو چکھا اور کہا کہ مجھے یہ شک ہے کہ اس کے اندر اسٹرائڈس (steroids) ملا ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ جرنلسٹ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ وہ فلاں مشہور انگریزی اخبار کا کرسپانڈنٹ ہے۔ اس کے بعد کتھا کار کافی سنجیدہ ہوگئے۔ اُنھوں نے کہا کہ اصل میں یہ ملہٹھی کا سفوف ہے۔ مذکورہ اخبار نویس نے یہ پڑیا مجھے دی اور میں نے اُس کو چکھا تو میرے اندازہ کے مطابق، اُس کا ذائقہ بالکل ملہٹھی جیسا تھا۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اپنی اصلاح کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز خود احتسابی (self-criticism) ہے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو دنیا میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔ سلف کریٹیسزم کیا ہے، اس کی مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ حال میں میں ریڈیو سُن رہا تھا۔ اس دوران اُس پر ایک فلم ایکٹر کا انٹرویو آنے لگا۔ انٹرویور نے پوچھا کہ اپنی زندگی کا کوئی خاص واقعہ بتائیے۔ فلم ایکٹر نے کہا کہ ایک بار ممبئی میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ میں اُس میں ایک رول ادا کر رہا تھا۔ اچانک فلم ڈائرکٹر نے شوٹنگ بند کر دی۔ میں اُس کے پاس گیا اور کہا کہ آپ نے شوٹنگ کیوں بند کر دی۔ فلم ڈائریکٹر نے کہا کہ تمہارا رول مجھے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا ہے۔

اب فلم ایکٹر نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ڈائریکٹر سے جھگڑنے لگے۔ اس کے بجائے وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ وہاں وہ آئینہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے بارے میں غور کرنے لگا۔ آئینہ میں جب اُس نے اپنی صورت دیکھی تو اصل راز اُس کی سمجھ میں آ گیا۔ بات یہ تھی کہ اُس دن صبح کو وہ مشہور تاج محل سیلون میں گیا اور شاندار طور پر اپنے بال درست کرائے اور شیمپو لگایا۔ اس طرح وہ ایک جینٹلمین تو دکھائی دینے لگا مگر وہ اپنے فلمی رول کے لیے غیر موزوں ہو گیا۔ اس لیے کہ فلم میں وہ ایک ایسے آدمی کا رول ادا کر رہا تھا جو فطری طور پر ناقص العقل تھا۔ اُس کو محسوس ہوا کہ میرا موجودہ چہرہ ایک صاحب عقل آدمی کا چہرہ دکھائی دیتا ہے، نہ کہ ناقص العقل آدمی کا چہرہ۔

اس دریافت کے بعد اُس نے یہ کیا کہ ایک قینچی لی اور آئینہ دیکھے بغیر وائلڈ ہیر کٹ (wild haircut) کے انداز میں اپنے بال کو بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر سے کاٹ دیا اور پھر اپنے

چہرہ اور بال پر مٹی لگالی۔ اس طرح اپنی صورت کو بگاڑ کر جب وہ فلم ڈائریکٹر کے سامنے آیا تو ڈائریکٹر نے کہا کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ اس کے بعد اُس نے اسی طرح پوری شوٹنگ کرائی۔ میں نے کہا کہ جو آدمی اپنی ترقی چاہتا ہو اُس کو نہایت بے رحمی کے ساتھ اپنی تنقید آپ کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔

ایک شخص نے نجی گفتگو کے دوران بتایا کہ میرا تجربہ ہے کہ ہندوؤں کو عیسائیت، جین ازم، سکھ ازم، بودھ ازم اور دوسرے مذہبوں سے کوئی نفرت نہیں۔ مگر میرا تجربہ ہے کہ اسلام کے خلاف اکثر ہندوؤں میں نفرت پائی جاتی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ آخر اس مسئلہ کا کیا حل ہے۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا سادہ اور آسان حل یہ ہے کہ مسلمان ردعمل کا طریقہ چھوڑ دیں۔ وہ یک طرفہ طور پر ہندوؤں سے محبت کرنے لگیں۔ دشمنی کا جواب دشمنی نہیں ہے۔ بلکہ دشمنی کا جواب محبت ہے۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے اور یہی تجربہ کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی دشمنی کوئی فطری چیز نہیں۔ وہ ہمیشہ اوپری اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی پتھر کے اوپر کچھ مٹی جم جائے۔ جیسے ہی آپ اُس کے اوپر پانی ڈالیں گے وہ بہہ کر ختم ہو جائے گی۔ ایسا ہی معاملہ اس قسم کی نفرت کا ہے۔ آپ محبت کے سیلاب سے دھو کر اس کو کسی بھی وقت صاف کر سکتے ہیں۔

۴ جون ۲۰۰۲ء کی صبح کو رشی کیش سے واپسی تھی۔ سوامی چیدانند سے آخری ملاقات کر کے روانہ ہوا۔ ہماری گاڑی چلتے ہوئے میرٹھ کے قریب پہنچی تو سڑک کے دونوں طرف سرسبز مناظر تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ مودی پورم ہے۔ تقریباً ۲۵ کیلومیٹر کے رقبہ میں ایک ہری بھری دنیا بنائی جا رہی ہے۔ اس میں انتہائی جدید قسم کی سہولتیں موجود ہوں گی۔ یہاں تک کہ اس میں فلم بندی کے انتظامات بھی ہوں گے۔ یہ نئی دنیا اُن دولت مندوں کے لیے بنائی جا رہی ہے جو شہر کے مسائل سے بیزار ہیں اور فطرت کی کھلی فضا میں رہنا چاہتے ہیں۔ مودی پُورم کو مودی نگر والوں نے بنایا ہے۔ مودی نگر (مودی انڈسٹریز) کو یہاں ۱۹۳۲ میں قائم کیا گیا تھا۔

مودی پورم کے مختلف منفی اور مثبت پہلو ہیں۔ اُس کا ایک پہلو یہ ہے کہ موجودہ ہندستان جس کو

کرپٹ سیاستداں آخری حد تک تباہ کر چکے ہیں، اُس کو یہاں کے تجارتی طبقہ نے بچایا ہے۔ ہندستان میں سینکڑوں سال سے تجارت کی روایات قائم تھیں۔ آزادی سے پہلے یہاں ایک طبقہ موجود تھا جو ملک کے اندر مضبوط تجارتی بنیاد قائم کر چکا تھا۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے ملک کو اقتصادی تباہی سے بچا رکھا ہے۔ ورنہ جہاں تک سیاسی لیڈروں کا تعلق ہے، اُنہوں نے پہلے سوشلزم کے نام پر ملک کو تباہ کیا تھا اور اس کے بعد لیڈروں کے ناقابل بیان کرپشن نے ملک کو بالکل کھوکھلا بنا دیا۔

کانفرنس کے منتظمین نے واپسی کے سفر کے لیے مجھے جو گاڑی دی تھی، اُس کا ڈرائیور ایک نوجوان تھا۔ اُس کا نام راکیش شرما تھا۔ وہ گاڑی کو تیز دوڑانے لگا۔ میرے ساتھی نے اُس کو منع کیا مگر وہ بدستور تیز دوڑاتا رہا۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ وہ بار بار اوورٹیک کرتا تھا۔ میرے ساتھی نے کسی قدر سختی کے ساتھ کہا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ سڑک کے دونوں طرف کئی گاڑیاں الٹی پڑی ہیں۔ کیا تم ہمارا انجام بھی یہی کرنا چاہتے ہو۔

اس کے بعد ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کر دی اور باہر نکل کر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس نے کہا کہ میں ایک پروفیشنل ڈرائیور ہوں۔ میں تو اسی طرح گاڑی چلاؤں گا۔ میرے ساتھی نے محسوس کیا کہ اگر ہم اس ڈرائیور سے ضد کرتے ہیں تو ہمارا سفر مزید مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے اُنہوں نے ڈرائیور کو منانے کی پالیسی اختیار کی اور پھر ہمارا سفر آگے کے لیے جاری ہو گیا۔ یہ واقعہ غازی آباد سے کچھ پہلے پیش آیا۔

اس تجربہ کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ سڑکوں پر جو حادثے ہوتے ہیں، اُن کا سبب زیادہ تر اپنے بارے میں بڑھا ہوا اعتماد ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں کسی قسم کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے وہ عام طور پر اس نفسیاتی مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے آس پاس اس کا برا انجام دیکھتے ہیں مگر اُن کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ — یہ دوسروں کا معاملہ تھا، میرے ساتھ ایسا ہونے والا نہیں۔

خدا کسی انسان کو زیادہ صلاحیت دیتا ہے تاکہ وہ زیادہ کام کرے۔ مگر وہ اپنی برخود غلط نفسیات کی بنا پر اکثر اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔ اپنے کو زیادہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایسا کام کر ڈالتا ہے

جو اُس کے لیے انتظامی حد (managable limit) سے باہر ہو۔ اکثر لوگوں کی ناکامی کا سبب اُن کا یہی مزاج ہوتا ہے۔

رشی کیش کا یہ سفر میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ وہاں جس ہندو سے بھی اسلام پر گفتگو ہوئی اُس نے دلچسپی کے ساتھ اُس کو سنا۔ کئی لوگوں کو کتابیں دی گئیں جن کو اُنھوں نے شوق کے ساتھ لیا اور پڑھنے کا وعدہ کیا۔ یہاں مجھے چند بار عمومی خطاب کا موقع ملا۔ اپنے خطابات میں میں نے اسلام کو دینِ رحمت کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی۔

میرا تجربہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ لوگ اس کو بہت بُرا مانتے ہیں کہ اُن کے اوپر مذہبی کٹّر پن کا الزام آئے۔ اس لیے وہ اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذہب کی بات کو توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔ یہ زمانی مزاج ہم کو موقع دیتا ہے کہ ہم دین حق کی دعوت کو موافق ماحول میں پیش کر سکیں۔

۴ جون ۲۰۰۲ کی رات کو میں واپس ہو کر دہلی پہنچا۔

۱ ۲۵ مئی ۲۰۰۲ کو جین ٹی وی (نئی دہلی) میں ایک خصوصی پروگرام تھا۔ اس کا موضوع تھا، اسلام اور امن۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک تقریر کی۔ اُنہوں نے بتایا کہ اسلام امن اور انسانیت کا مذہب ہے، وہ جنگ اور تشدد کا مذہب نہیں۔

۲۔ رشی کیش میں ۴ جون ۲۰۰۲ کو پرمارتھ نکیتن کے زیر اہتمام بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس میں ٹاپ کے ہندو پیشوا شریک ہوئے۔ اُس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اُس میں شرکت کی اور اس موضوع پر ایک تقریر کی کہ مختلف مذاہب کے درمیان معتدل تعلقات کس طرح قائم کیے جائیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ اس معاملہ میں اسلام کا فارمولا یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا پورا احترام کیا جائے اور کسی بھی حال میں یا کسی بھی عذر کی بنا پر ٹکراؤ اور تشدد کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

۳۔ وی آئی پی فیملی میگزین (جے پور) کے نمائندہ مسٹر محمد رفیق نے ۱۳ جون ۲۰۰۲ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم خواتین کی تعلیم سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں مسلم مردوں کے ساتھ مسلم عورتیں بھی تعلیم میں آگے رہی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سارے ملک میں کثرت سے مسلم لڑکیوں کے لیے اسکول اور مدرسے کھولے جارہے ہیں۔ مسلم خواتین بہت بڑے پیمانہ پر تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ یہ مدرسے اور اسکول گویا مسلم خواتین کے لیے ایک نئے دور کی علامت ہیں۔

۴۔ سوتنتر وچار منچ کے تحت ۱۹ جون ۲۰۰۲ کو نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: ٹیررزم اور انڈیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ایک مفصّل تقریر کی۔

۵۔ دہلی کے ہفتہ وار ہندی اخبار ’’راشٹر یہ وشواس‘‘ کے نمائندہ مسٹر بابولال شرما نے ۲۱ جون ۲۰۰۲ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ملک اور ملت دونوں قسم کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ یہ صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں مختلف مقامات پر جہاد کے نام پر جو متشددانہ تحریکیں چل رہی ہیں ان سے اسلام کی تصویر خراب ہو رہی ہے۔ مگر اس کا سبب اسلام کی تعلیمات نہیں ہیں۔ اسلام مکمل طور پر امن اور انسانیت کا مذہب ہے۔ مسلمان اپنی قومی تحریکوں کو اسلامی جہاد کے نام پر چلاتے ہیں، اس لیے اس کی وجہ سے اسلام بدنام ہو رہا ہے۔ اگر وہ سری لنکا جیسے لوگوں کی طرح اپنی تحریک کو قومی بنیاد پر چلائیں تو ان کی تحریک کا خواہ جو بھی نتیجہ ہو مگر اس کی وجہ سے اسلام بدنام نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ایسی حالت میں ان کی تحریک کی رپورٹنگ پریس میں مسلم قوم کے حوالہ سے آئے گی، نہ کہ مذہب اسلام کے حوالہ سے۔

٦۔ ۲ جولائی ۲۰۰۲ کو نئی دہلی کے اینا ڈو ٹی وی (EENADU TV) نے صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع تھا: اسلام اور تعلیم۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام تعلیم کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا سبب اسلام نہیں ہے۔ اُس کے اسباب زیادہ تر سیاسی ہیں۔

۷۔ برطانیہ کے دو اسکالر کرس فلپاٹ (Chris Philpolt) اور فرزر گرانٹ (Frser Grant) ۱۰ جولائی ۲۰۰۲ کو صدر اسلامی مرکز سے ملے۔ انہوں نے اپنی ایک زیر تصنیف کتاب کے لئے تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کی کتاب کا ٹائٹل اور موضوع یہ ہے:

Millennium Choices; Global Environmental Problems, Spiritual Traditions, a rediscovery of Green Spirituality.

ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر ماحولیات اور روحانیات کے بارے میں تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ان دونوں موضوعات پر اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ نیز ان کا سوال یہ تھا کہ موجودہ ماحولیاتی مسائل کے بارے میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے سوالات کے جوابات دئے گئے۔

۸۔ مائنارٹیز کمیشن کے زیر اہتمام ۱۴ جولائی ۲۰۰۲ کو نئی دہلی میں ایک سیمینار ہوا۔ اس میں ہر مذہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارے مسائل کا حل رواداری اور مفاہمت کے اصول پر ہی نکل سکتا ہے۔ ٹکراؤ کا طریقہ کسی کے لیے بھی مفید نہیں۔

۹۔ بی بی سی لندن (انگریزی پروگرام) کے تحت ۱۴ جولائی ۲۰۰۲ کو ایک انٹرویو ہوا۔ انٹرویور مسٹر نابلینک (Noblank) لندن کے بُش ہاؤس سے بول رہے تھے اور نئی دہلی کے بی بی سی آفس سے صدر اسلامی مرکز اُن کے سوالات کے جوابات دے رہے تھے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ بائیکاٹ کی پالیسی کوئی پالیسی نہیں۔ بلکہ دونوں گروہوں کے درمیان سنجیدہ ڈائیلاگ ہونا چاہئے۔

۱۰۔ جین ٹی وی (نئی دہلی) میں ۱۶ جولائی ۲۰۰۲ کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ اس کا موضوع تھا کہ ہندستان کے ہندو اور مسلمان مل جل کر کس طرح امن کے ساتھ رہیں۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔

۱۱۔ جامعہ ہمدرد (نئی دہلی) کے کنونشن سنٹر میں ۲۱ جولائی ۲۰۰۲ کو حکیم عبدالحمید مرحوم، بانی جامعہ کی یوم وفات کے موقع پر ایک اسلامک کوئز کمپٹیشن کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور تقسیم انعامات کے علاوہ ایک تقریر کی۔ تقریر میں انہوں نے طلباء اور طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب اور جامعہ ہمدرد میں آپ کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ یہ جگہ جہاں آج ہمدرد یونیورسٹی ہے، یہاں ۱۹۴۷ میں صرف جنگل تھا۔ انہوں نے شیکسپیئر اور برنارڈ شا کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ شیکسپیئر کی موت اور برنارڈ شا کی وفات میں تقریباً ڈھائی سو سال کا فاصلہ ہے۔ اس واقعہ کو لے کر برنارڈ شا نے کہا تھا کہ میرا قد شیکسپیئر سے چھوٹا ہے مگر میں شیکسپیئر کے کندھوں کے اوپر کھڑا ہوں:

I am smaller in stature than shakespeare,
but I stand upon his shoulders.

انہوں نے نوجوان طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرا قد حکیم عبدالحمید سے چھوٹا ہے مگر میں حکیم عبدالحمید کے کندھوں پر کھڑا ہوا ہوں۔ ۱۹۴۷ میں حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز جنگل کی سطح سے کیا تھا آج آپ اپنی زندگی کا آغاز یونیورسٹی کی سطح سے کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ اس کا شکرادا کیجئے اور عزم وہمت کے ساتھ ایک نئے مستقبل کی طرف اپنا سفر شروع کر دیجئے۔

۱۲۔ راشٹریہ سہارا اُردو (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر ودود ساجد نے ۲۴ جولائی ۲۰۰۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ ایک ہندو پارٹی نے مانگ کی ہے کہ قرآن کی کچھ آیتوں کو قرآن سے نکال دیا جائے۔ جواب میں کہا گیا کہ قرآن کی آیتوں پر یہ اعتراض سراسر لغو ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ قرآن اپنے مخاطبین کو الانسان اور الناس کہہ کر خطاب کرتا ہے اس لیے قرآن کے مطابق، ساری دنیا دارالانسان ہے، نہ کہ دارالکفار۔ مائناریٹی کمیشن کے ڈائیلاگ (۱۴ جولائی) کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ اس کے بارہ میں یہ نہ کہئے کہ وہاں ملی نمائندے نہیں تھے بلکہ یہ کہئے کہ وہاں ملی دادا نہیں تھے۔

۱۳۔ حیدرآباد سے مولانا سید اکبر الدین قاسمی اپنے خط مورخہ ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ میں لکھتے ہیں:
یکساں سول کوڈ آپ کا مؤقر کتابچہ جو اس موضوع پر ہزاروں کتابوں پر بھاری ہے وہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے حالیہ اجلاس (حیدرآباد) کے موقع پر شرکاء اجلاس میں تحفۃً تقسیم کیا گیا۔ اس کو بہت پسند کیا گیا۔ میرٹھ کے سفرنامہ میں مسلم انٹلیکچول فورم کا آپ نے تذکرہ فرمایا تھا، اسی نہج پر یہاں کام کرنے کے لیے یہ فورم قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔

۱۴۔ ۱۸ اگست ۲۰۰۲ کو نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب (اسپیکر ہال) میں ایک گوشٹھی ہوئی۔ اس کا انتظام سار بدیشک آرے پرتی ندھی سبھا نے کیا تھا۔ اُس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اُس میں شرکت کی اور قومی ایکتا کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۱۵۔ دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں ۱۵ اگست ۲۰۰۲ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ یہاں اشوک سنگھل نے اپنی تقریر میں کہا کہ قرآن کہتا ہے کہ کافروں کو مارو۔ اس کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ قرآن میں کافر سے مراد کوئی نسل یا قوم نہیں۔ اس سے مراد پیغمبر کے وہ معاصر منکرین ہیں جنہوں نے آپ اور آپ کے اصحاب کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اور پیغمبر اور آپ کے اصحاب کو دفاع میں ان سے لڑنا پڑا۔

۱۶۔ سعودی ٹی وی اور ایجپٹ ٹی وی کے نمائندہ مسٹر محمد بسّام نسّان مصری نے ۱۸ اگست ۲۰۰۲ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ حالت میں پاکستان کے سامنے صرف دو آپشن ہیں۔ یا تو وہ حالت موجودہ (statusquo) کو مان کر معاملہ ختم کردے یا تشدد کو براہ راست اور بلاواسطہ دونوں اعتبار سے مکمل طور پر چھوڑ کر پُرامن ڈائیلاگ کا طریقہ اختیار کرے۔

۱۷۔ نیشنل کونسل آف ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ (نئی دہلی) کی طرف سے ۱۹ اگست ۲۰۰۲ کو ایک سیمینار رہوا۔ یہ سیمینار جامعہ ہمدرد (نئی دہلی) کے کنونشن ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اُس میں شرکت کی اور وہاں ایک تقریر کی۔ اس کا موضوع تھا: ہندستانی اسکولوں میں ویلو ایجوکیشن۔ اس موضوع پر ایک مفصل تقریر کی گئی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ نصاب میں کچھ اخلاقی کتابیں شامل کرنے سے نوجوانوں میں اخلاق نہیں آجائے گا۔ اس مقصد کے لیے ایک ہمہ جہتی کوشش کی ضرورت ہے۔

۱۸۔ سہارا ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۲۱ اگست ۲۰۰۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ گجرات کی گورو یاترا کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ یہ گورو یاترا نہیں ہے بلکہ وہ الیکشن یاترا ہے۔ اس کو پری الیکشن سرگرمیوں کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔

۱۹۔ ایناڈو ٹیلی ویژن (EENADU TV) نے ۲۳ اگست ۲۰۰۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو

ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر گجرات کے فساد سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ فساد کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نفرت اور غلط فہمی کے ماحول کو ختم کیا جائے۔ اس کے بغیر فساد کا مستقل خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

۲۰۔ جین وشو بھارتی انسٹی ٹیوٹ (راجستھان) کی خاتون وائس چانسلر سُدھا ماہی نے ۳۱ اگست ۲۰۰۲ کو اپنے انگریزی میگزین (You) کے لیے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا خاص موضوع یہ تھا کہ پازیٹیو تھنکنگ کیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ پازیٹیو تھنکنگ یہ ہے کہ آدمی کی سوچ اتنا زیادہ ترقی کر چکی ہو کہ وہ منفی صورت حال میں بھی مثبت رسپانس دے سکے۔ ایک اور سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ ہر مرد اور عورت کو یکساں احترام کے قابل سمجھنا چاہیے اور ہر حال میں پُر امن روش پر قائم رہنا چاہیے۔

۲۱۔ نئی دہلی (جن پتھ) کے نیشنل میوزیم میں ۱۲ ستمبر ۲۰۰۲ کی شام کو ایک سیمینار ہوا۔ اس کا انتظام نہرو یووا کیندر کی طرف سے کیا گیا تھا۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں خصوصی مقرر کے طور پر خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کا موضوع تھا: اسلام کیا ہے۔ اس موضوع پر دو گھنٹہ کا پروگرام تھا۔ آخر میں حاضرین کی طرف سے سوالات کیے گیے اور اُن کے جوابات دیے گئے۔

۲۲۔ ستمبر ۲۰۰۲ کے وسط میں ادارہ الرسالہ ہندی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

۲۳۔ انڈین کونسل آف ریلیجس لیڈرس (نئی دہلی) کی طرف سے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کا ایک وفد اجودھیا لے جایا گیا۔ وہ لکھنؤ اور فیض آباد ہوتے ہوئے اجودھیا پہنچا۔ یہ پروگرام ۱۹۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۲ کو ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کو بھی شریک کیا گیا تھا۔ اس سفر میں مختلف ہندو رہنماؤں سے گفتگو ہوئی اور اجودھیا کے ایک بڑے جلسہ میں خطاب کیا۔ اس خطاب کا خلاصہ یہ

تھا کہ ملک کی ترقی ٹکراؤ کے ذریعہ نہیں ہوسکتی بلکہ رواداری اور میل ملاپ کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔

۲۴۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۲ کو راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر ودود ساجد نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ گودھرا اور گجرات جیسے فسادات کا حل کیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کا حل یہ ہے کہ ایک طرف سماج کی جانب سے کھلی مذمت اور دوسری طرف حکومت کی جانب سے مجرمین کو مکمل سزا۔ ہمارے ملک میں یہ دونوں کام نہیں ہوئے۔ اخلاقی مذمت جانبدارانہ انداز میں کی جاتی ہے، اسی طرح حکومت کی طرف سے مجرمین کو سزا نہیں ملتی۔ اگر یہ دونوں باتیں ہوں تو فسادات بہت کم وقت میں ختم ہوجائیں۔

۲۵۔ گاندھی سمیتی کے زیر اہتمام برلا ہاؤس (نئی دہلی) میں ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۲ کو ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ نوجوانوں میں پیس اور ڈسپلن کس طرح لایا جائے۔ اُس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اُس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک تقریر کی۔ حاضرین میں زیادہ تر نوجوان لوگ تھے۔

۲۶۔ تہران ریڈیو نے ۷ اکتوبر ۲۰۰۲ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک امریکی مصنف نے لکھا ہے کہ اسلام ٹیررزم کا مذہب ہے۔ سوالات کا تعلق اسی سے تھا۔ جواب میں دلائل سے بتایا گیا کہ یہ ایک لغو بات ہے۔ اس الزام کی تردید میں میری متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ تازہ کتاب کا نام ہے، آئیڈیالوجی آف پیس۔

۲۷۔ نظریۂ امن (Ideology of Peace) کے نام سے ایک تازہ کتاب تیار ہوئی ہے۔ فی الحال وہ انگریزی زبان میں چھپی ہے جو ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ وہ اردو میں بھی شائع ہوگی۔